DATE

مخصوص کارڈ

مصنف :- ناصری لکھنوی (شیخ

عنوان :-

مرتب :-

موضوع :-
اردو شاعری

12

نذرِ احباب

ناصری لکھنوی

نذرِ احباب

یعنی

کُلّیاتِ ناصری

از نتیجہ افکار

جناب مولوی شیخ مہدی حسین صاحب ایم۔ اے۔ ناصری لکھنوی

مرحوم و مغفور

حسب فرمائش

پروفیسر پنڈت امرناتھ جھا صاحب ایم۔ اے

صدر شعبہ انگریزی الہ آباد یونیورسٹی

مطبوعہ انڈین پریس لمیٹڈ۔ الہ آباد

۱۹۳۳ء

باہتمام کالی۔ کے متر ا۔ پرنٹر
انڈین پریس لمیٹڈ۔ الہ آباد

فہرست مضامین



تمہید

جناب شیخ مہدی حسین صاحب ناصری لکھنوی اعلی اللہ مقامہ کا مجموعہ غزلیات جو نذرِ احباب کے نام سے آپ کے پیش نظر ہے جناب مرحوم کی ایسی یادگار ہے جس کو ان کے احباب سُرمۂ چشم کی طرح آنکھوں سے لگائیں گے۔ اور جو مرحوم کے نام کو آئندہ نسلوں میں زندہ رکھے گا۔ جناب مرحوم کے کلام کا بہت بڑا حصّہ ان کی زندگی ہی میں تلف ہو گیا تھا جس کا افسوس کے ساتھ اکثر ذکر فرمایا کرتے تھے۔ اور اس واقعہ سے اتنا متاثر تھے کہ اپنے جدید کلام کے بھی جمع کرنے کا خیال بالکل چھوڑ دیا تھا۔ مرنے سے دو برس پہلے احباب کے اصرار سے دل کے پراگندہ ٹکڑوں کو یکجا کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ کچھ غزلیں کتابوں میں رکھی ہوئی ملیں۔ کچھ قدرشناس احباب کے پاس سے نکلیں اور کچھ حافظہ نے پیش کیں۔ ان سب کو اکٹھّا کرنے کے بعد گم شدہ کلام کی جانب توجّہ ہوئی۔ جو اشعار یاد آئے اُن کو قلمبند کر کے اس مجموعہ کو مرتب کیا۔ فرائض منصبی کی انجام دہی سے فرصت ملتی تھی تو کبھی کبھی اس پر نظر ثانی بھی فرمایا کرتے تھے۔ مسودہ کی شکل میں اس کو میں نے مرحوم کی حیات ہی میں جا بجا سے دیکھا تھا۔

اس کے چھپانے کی بابت عجب دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اس کو پُرانے دواوین کی وضع پر طبع کراؤں گا۔ نہ اس میں تقریظ ہو گی نہ تنقید ہو گی۔ نہ مقدمہ ہو گا نہ تمہید ہو گی میرے پارہائے جگر ہوں گے اور احباب کی نظریں۔ جو پسند آجائیں وہ اُن کی نذر ہیں۔ جو ناپسند ٹھہریں وہ میری قسمت کے ہیں۔ ہر دو حالت لطف

سے خالی نہ ہوگی۔

اپنے بیٹے نصیر حسین سلمہٗ کو مسودہ صاف کرنے کے لئے دیا۔ ابھی تمام و کمال صاف نہ ہو چکا تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہنا پڑا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

مرحوم کی دائمی مفارقت سے اُن کے ہر ملنے والے کو صدمہ ہوا۔ اُردو اور انگریزی اخباروں میں پُر درد مضامین نکلے۔ قطعات تاریخ وفات شائع ہوئے۔ اس اندوہ ناک موت پر بعض احباب نے مرثیے بھی کہے۔ اب تک لوگ تعلیمی کمیٹیوں اور ادبی صحبتوں میں ان کو یاد کر کے اظہار حزن و ملال کرتے ہیں۔

اور میرا خیال ہے کہ مرحوم کی خوش اخلاقی۔ علمی قابلیت۔ ادبی اور تعلیمی خدمت عرصہ دراز تک ان کی یاد کو حلقہ احباب میں زندہ رکھے گی۔

مرحوم کے انتقال سے اس مجموعہ کی اشاعت کی اُمید بالکل منقطع ہوگئی تھی۔ مگر مکرمی جناب پروفیسر پنڈت امرناتھ جھا صاحب صدر شعبہ انگریزی الہ آباد یونیورسٹی کی علم دوستی۔ قدر شناسی اور ادب نوازی نے اس مجموعہ کو زیب طاق نسیاں نہ ہونے دیا۔ ملک کے فاضل ادیب جناب خان بہادر نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی۔ ڈپٹی کلکٹر رائے بریلی سے التجا کی کہ وہ اس پر مقدمہ تحریر فرمائیں۔ اور انڈین پریس میں جس کا شمار صفائی۔ خطاطی اور طباعت کے اعتبار سے اس وقت ہندوستان کے مشہور مطابع میں ہوتا ہے اس کو طبع کرایا۔

یہ مجموعہ جناب ناصرؔی مرحوم کی یادگار ہونے کے ساتھ ساتھ پروفیسر صاحب موصوف کے خلوص محبّت اور دوست پرستی کا نمونہ بھی ہے۔ قابل ستائش ہیں وہ ہستیاں جو اپنے دوست کی یاد کو غیر فانی بنانے کی کوشش کریں۔

سیّد محمد ضامن علی

اُردو ڈپارٹمنٹ
الہ آباد یونیورسٹی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

فروری ۱۹۳۱ء کی مسلم ہوسٹل میگزین الہ آباد میں پروفیسر امرناتھ جھا صاحب نے انتہائے محبت و قدر افزائی سے میرے اور شیخ مہدی حسین ناصری مرحوم کے کلام پر ایک ساتھ تبصرہ کیا، کس کو خبر تھی کہ اس اتصال میں یہ راز مقدر ہے کہ ناصری بہت جلد داغ مفارقت دے جائیں گے اور آخر اُن کے کلام پر مقدمہ لکھے گا۔

ناصری میرے ہم وطن تھے اور اُس وقت سے باہم لطف تھا جب دونوں طالب علموں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ گردش زمانہ و فکر معاش نے تفرقہ ڈالا اور مدت کے بعد ملاقات کی تجدید مشاعروں میں ہوئی۔

فی زمانتا بہت کم ایسے نفوس ہونگے جو علم و فضل و کمال میں ناصری مرحوم کے ہم پایہ ہوں۔ اُردو صرف اُن کی مادری زبان نہیں تھی بلکہ اس کے محقق بھی تھے۔ عربی، فارسی، عبرانی، انگریزی اور جرمنی زبانوں میں بھی دستگاہ تھی۔ مختلف کتابوں کے مصنف تھے۔ تحریر کی طرح تقریر

بھی شگفتہ و دلکش ہوتی تھی، واعظ تھے، خطیب تھے، مقرر تھے مگر تلخ نوائی سے کوسوں دور، زاہد تھے مگر زندہ دل، مسلمان اور مذہب کے پابند مسلمان تھے مگر تعصب سے بری اور باوصف تمام اوصاف وکمالات کے بے حد متواضع و منکسر مزاج۔ دوستوں کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے اور شاگردوں سے اولاد کی طرح محبت کرتے تھے۔

اُن کی قدر و منزلت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اُنھوں نے علم و عروج محض اپنے زورِ بازو اور عزم و استقلال سے حاصل کیا۔ تاہم نام و نمود سے ہمیشہ متنفر رہے۔ کلام کی اشاعت سے احتراز کرتے تھے اور مشاعروں میں بھی احباب کے اصرار اور پاس خاطر سے شریک ہوتے تھے۔

ناصری کی استعداد علمی بہت وسیع تھی مگر خالص تغزل اور نرم و شیریں زبان کے دلدادہ تھے، شاید یہ اثر حضرت رشید مرحوم کی شاگردی کا تھا جنھیں فارسی تراکیب اور پرشکوہ الفاظ سے خفقان ہوتا تھا، اُن کا قول تھا کہ غزل اس کی متحمل نہیں۔ اُن مغفور کے تتبع میں ناصری بھی تصوف و فلسفہ کو دائرہ غزل سے خارج سمجھتے تھے۔ مگر جناب رشید کے انتقال کے بعد آخری حصۂ عمر میں رنگ زمانہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اس طرف کی غزلوں میں کہیں کہیں تصوف کی جھلک موجود ہے۔ درد بھرے الفاظ میں ماجرائے عشق بیان کرنا اُن کی شاعری کا نصب العین تھا اور بیشتر حصہ کلام تاثیر کا طلسم ہے۔ واردات قلب اس طرح نظم کر دیتے ہیں

کہ شعر دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔ اُستاد کے فیض صحبت کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ قدرت سے درد آشنا دل پایا تھا اُن کی غزل اسی دل کی سرگزشت ہوتی تھی۔ افتادِ طبیعت کی بنا پر میرؔ اُن کا محبوب شاعر تھا چنانچہ ایک نظم موازنۂ میرؔ و غالبؔ کے عنوان سے کہی جس کے آخری دو شعر یہ ہیں ؎

ناصری فیصلہ غالب ہی سے سن لو تو کہو
کہ ہم آشفتہ مزاجوں کا کوئی پیر بھی تھا
"ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ
سُنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا"

اس طرح غالبؔ کا مقطع ایک نئی اہمیت حاصل کرتا ہے۔

ناصری کا کلام دو حصّوں میں منقسم ہے: پہلا حصّہ رشیدؔ مرحوم کی اصلاح سے مزین ہے۔ دوسرا حصّہ شفیق اُستاد کی وفات کے بعد معرض وجود میں آیا۔

جیسا پروفیسر امرناتھ جھا صاحب نے ارشاد فرمایا ناصریؔ کا کلام حسرت و حرماں کا آئینہ ہے مگر اس میں جھوٹ موٹ کی ہائے وائے نہیں ہے بلکہ ایک ٹوٹے ہوئے دل کی فریاد ہے جو سننے والے کے تارِ رگِ جاں کو مضرابِ اضطراب سے چھیڑ دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص جو فلسفہ حزن کا ماہر ہے نفسیات کے راز و گداز نغموں میں دُہرا رہا ہے اور سننے والوں کے جسم و روح میں سنسنیاں بھر رہا ہے۔ کہیں کہیں خوشی کی ترنگ بھی ہے۔ مگر اسکا منشا صرف اسقدر ہے کہ المناکی اور اُجاگر ہو جائے جسطرح راگ کی دل آویزی سرگم سے بڑھ جاتی ہے۔

ناصریؔ کے شعر اسقدر صاف و سادہ و عام فہم ہیں کہ شرح کے محتاج نہیں تاہم کچھ نہ کچھ لکھنے کی جسارت کرتا ہوں۔

حصّۂ اوّل

غمِ عشق کا ماجرا سنانے کو ایک ہمدرد کی ضرورت ہے اور ہمدرد مفقود۔ جو شخص اس درد کی جانگدازی و دل خراشی کا اندازہ نہیں کر سکتا اُس سے کچھ کہنا تضیع اوقات نہیں بلکہ غمِ عشق کی توہین ہے۔ انداز بیان سے ٹپکتا ہے کہ دردِ دل سُنانے کی حسرت ہے مگر سننے والا نہیں ملتا۔ شعر کی اثر آفرینی کا راز اسی نکتہ میں ہے۔ ؎

دل سوز ہو کوئی تو سُنے دل کا ماجرا
کس کو سُنائیں حال غمِ جانگداز کا

ہجر اور ہجر میں کسی کا انتظار، انتظار میں اضطراب، اضطراب میں بیخودی کی تصویر اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے۔ ؎

شبِ فرقت میں اتنا بیخودی کا مجھ پہ عالم تھا
کوئی کچھ پوچھتا تھا میں تمہارا نام لیتا تھا

ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ ناصری نے وہ رنگ تغزل اختیار کیا جس میں معشوق ایک پری چہرہ انسان ہے، حسن مطلق سے عشق کا اظہار یا نفس عشق سے بہت کم گفتگو ہے (اس طرف آرہے تھے مگر افسوس عمر نے وفا نہ کی)۔ ایسی شاعری میں رقیب، غیر وغیرہ کا تذکرہ ناگزیر ہے ان حدوں میں آرٹ کے نقطۂ نظر سے یہ شعر بے حد دل کش ہے ؎

کی اُدھر پھر کے نظر، غیر سے ساغر مانگا

مجھسے دل آپ نے مانگا بھی توکیونکر مانگا

معشوق کو خط لکھنا، جواب کے لئے بیتاب و سراسیمہ رہنا، جواب آنے پر (خواہ جواب صاف ہو) قاصد کو گھنٹوں باتوں میں اُلجھائے رکھنا مقتضائے شوق اور عاشقوں کا چلن ہے۔ ناصری نے بھی یہی کہا ہے مگر شعر میں ایک ایسا دلخراش ٹکڑا رکھدیا ہے جو امید و بیم کی تمام منزلیں پیش نظر کردیتا ہے۔ آہ وہ دلدادۂ محبت جس کو صرف اپنی بیکسی کا سہارا ہو۔ ؎

کسی بیکس پہ کرم کرتے بھی پایا تھا اُسے

یا بپا دیکھا تھا ہنگامۂ محشر قاصد

(پوری غزل اسی ایک مضمون میں ہے)۔

دل میں ہزاروں آرزوئیں ہیں اور ہر آرزو حرماں سے وابستہ ہے، انداز بیان مایوسانہ نہ ہو تو کیسا ہو۔ ؎

نہ پوچھو کس طرح حال دل دیوانہ کہتے ہیں

ہزاروں آرزوئیں ہیں جو مایوسانہ کہتے ہیں

پروانہ اپنا سوز اور شمع اپنا گداز زبان حال سے بیان کرتے ہیں انسان میں سوز و گداز جمع ہو گئے ہیں اسکا افسانہ اُن سے زیادہ لطیف و رنگین ہے ؎

جو کچھ آپس میں شب بھر شمع اور پروانہ کہتے ہیں

اکیلے آپ کے عاشق وہی افسانہ کہتے ہیں

یہ شبہہ پیدا نہ ہو کہ پروانہ (واحد) کی جگہ پروانے (جمع) چاہئے۔ شاعر نے

ایک شمع اور ایک پروانے کو مختص کر کے تمام شمعوں اور پروانوں کا نمائندہ بنا دیا ہے۔

محرومیِ قسمت کی انتہا یہ ہے کہ قضا کوئی حیلہ بھی نہیں ڈھونڈتی جسے مرگ بیکسی کا پردہ بنایا جائے۔ قتل ہو رہے ہیں مگر قاتل کے ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔ قاتل ایسے حربے استعمال کر رہا ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ دل کو گھائل کر رہے ہیں مثلاً ایک نگاہ بدگمان، ایک خفیف سی جنبش ابرو، پلکوں کا اشارہ، ایک حرف زیر لب، ایک سکوت مبہم جس کی ترجمانی مشکل ہے ؂

مرنا وہ جس کو حیلۂ آزار بھی نہیں
قاتل وہ جس کے ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ایک مدت غیرت عشق کا تقاضا رہا کہ حال دل کسی پر افشا نہ ہو۔ یوں ہی قرار آجائیگا۔ یہ امید موہوم ثابت ہوئی اور اندازہ ہوا کہ حالت کہے بغیر تسکین محال ہے، مگر آہ یہ بات اُس وقت سوجھی کہ طاقت گفتار جواب دے چکی تھی، اب ایک خلش ہے، ایک حسرت ہے جسکا مداوا نہیں ؂

تسکین دل محال ہے حالت کہے بغیر
اس پر ستم کہ طاقت گفتار بھی نہیں

بلاغت کا ایک اسلوب یہ ہے کہ کوئی کیفیت بیان کر کے ایک ایسا جز مبہم چھوڑ دیا جائے جس میں ترقی کا امکان باقی رہے۔ درد جگر نے نالوں پر اُبھارا، نالے کئے، حشر برپا ہوا، ایذا سے نالہ نے درد جگر اور بڑھا دیا۔

اب کیا ہوگا حشر تو ہو چکا؟ ؎

نالے کرتا ہوں میں اک حشر بپا ہوتا ہے بڑھ گیا درد جگر۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے

احساس بیکسی ہی کیا کم آفت ہے مگر جب اسکے ساتھ یاس و حسرت، درد و غم کی بھی دل پر یورش ہو تو قیامت ہے ؎

یاس و حسرت، درد و غم ان سب کی منزل ایک ہے
بیکسی میں آفتیں اتنی ہیں اور دل ایک ہے

معشوق کا بھولے پن سے پوچھنا کہ میرا نام سُن کر کیوں تڑپ اُٹھتے ہو۔ جواب ضروری مگر اظہار تمنّا آداب عشق کے منافی، لہذا کہتے ہیں ؎

مَیں تو عاجز ہوں تمھیں پوچھو دلِ ناکام سے
کیوں تڑپ اُٹھتا ہے سینے میں تمھارے نام سے

بعض کیفیتیں کسی کسی شعر میں اس طرح نظم ہو جاتی ہیں کہ اُنکی شرح دوسرے الفاظ مین ناممکن ہے۔ الفاظ و معنی میں اس قدر چسپاں ربط ہوتا ہے کہ وہی مطلب ادا کرنے کو دوسری عبارت گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ دفتر کے دفتر لکھ جائیے مگر شعر کے لطف میں اضافہ کیسا اُسکی روح سے مغائرت ہوتی جائیگی۔ ؎

شبِ غم ہے دربند ہیں آسماں کے کہ بیمار ہیں کچھ دعا کرنے والے

"دربند ہیں آسماں کے" اس فقرے سے جو حیرت اور ہیبت دل پر طاری ہوتی ہے۔ دعا کی اہمیت اور تاثیر میں ڈوبے ہونے کے باوجود نامستجاب رہنے کا اہتمام، منزلت عشق و ناکامیِ عشق کے وہ اسرار پیش کرتا ہے جنکے انکشاف کو زبان و بیان قطعاً ناکافی ہیں۔

حصّۂ دوم

حصۂ اوّل سے زیادہ انمول جواہر کا گنجینہ ہے مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ دل کھول کے داد دے سکوں۔ایک مختصر انتخاب پیش کئے دیتا ہوں

سیرِ دریا کرنے والے ہم بھی یاد آئے کہیں
کوئی ٹکرایا سفینہ کیا لبِ ساحل نہ تھا

ہو خاکسار بن کے سرافراز ناصری
ورنہ یہ فخرِ بندگیِ بوتراب کیا ؟

تلاطم بحرِ الفت کا یہی بڑھ بڑھ کے کہتا ہے
تباہی کو یہاں کہتے ہیں بیڑا پار ہو جانا

دنیا کو حسینوں کا دیدار مبارک ہو
ہم کو تو جہاں دل ہو اُس سمت نظر کرنا

ہر اک کو حال دل رو کر سُنایا نہ پہچانا ذرا اپنا پرایا

برسات ختم ہو گئی بادل برس گئے
رو جائے جس طرح سے کوئی دل بھرا ہوا

ہماری منزلِ مقصود نامرادی ہے
خدانخواستہ کیوں کوئی مہرباں ہوتا

کامل جو بیخودی ہو تو عینِ شہود ہے
غافل جو ہو گیا ہے وہ غافل نہیں رہا
طوفاں فقط تھا میری تباہی کے واسطے
دریا نہیں رہا ہے کہ ساحل نہیں رہا

دل سنبھلتا ہی نہیں، آنکھ ٹھہرتی ہی نہیں
کس طرح کھینچ لوں نقشہ تری رعنائی کا
مر کے آنکھیں ہوئیں روشن ترے جلوے دیکھے
زندگی نام تھا شاید شبِ تنہائی کا

پرِ قدرت کی مہریں جا بجا پھولوں پہ ہیں بلبل
ترا گلزار محضر بن گیا خونِ شہیداں کا
خزاں میں گر کے ہر برگِ شجر آواز دیتا ہے
کہ اُلٹے گا یوہیں اک دن ورق اس بزمِ مکاں کا

موت کے پردے میں پنہاں زیست کا انجام تھا
کچھ اندھیرا بیچ میں آگے خدا کا نام تھا

رشکِ صد گلشن بیاباں تھا جنوں کے دور میں
اب وہ دَور آیا کہ ہر گلشن بیاباں ہو گیا

نویدِ زندگی کے ساتھ پیغامِ اجل پایا
کہ تم نے دلربائی میں نے دل روزِ ازل پایا

الحذر اے مانگنے والے مرادِ عشق کے   یہ نہ سمجھا تو کہ اپنا آپ دشمن ہو گیا

باغ کو پا کے آئینہ حسن و جمالِ یار کا
مجھ کو جنون ہو گیا نام ہوا بہار کا

قفس میں پکاروں جو میں ہم صفیرو
تو آواز پر میری آواز دینا

دل کے ارماں چل بسے بربادیِ دل دیکھ کر
اُٹھ گئی محفل کی محفل رنگ محفل دیکھ کر

مضطرب روح کوئی آگئی میخانے میں
خود بخود مے کو ہے گردش مرے پیمانے میں

دل کی اُجڑی ہوئی بستی کو غنیمت سمجھو
جو خزانہ ہے نہاں ہے اسی ویرانے میں

ناصری ایک وہ ہیں جنکو تغافل پہ ہے ناز
ایک ہم ہیں کہ اُنھیں یاد کئے جاتے ہیں

وہ دیارِ حسن کے آستاں وہ رواج و رسم کہ الاماں
وہی سر ہمیشہ قلم ہوئے جو جُھکے سجود نیاز میں

پلا کے جام فنا مژدۂ بقا نہ سُنا
کہ زیست کا کسی عالم میں اعتبار نہیں

نزع کا وقت ہے دُنیا مری ہوتی ہے تمام
ہاں دکھا جلوہ کہ تو وعدہ فراموش نہیں

پیام عیش کے روز آسماں سے آتے ہیں
میں جانتا ہوں یہ ناوک جہاں سے آتے ہیں

جہاں تھا جوشِ تجلّی، جہاں تھا دورِ الست
ہمارے ساغر و مینا وہاں سے آتے ہیں

قفس میں چین ملے گا بلا نصیبوں کو
بہت ستائے ہوئے آشیاں سے آتے ہیں

کششِ حُسن خداداد دُہائی تیری
شمع نے کھینچ لیا بزم میں پروانے کو

آسماں پر ابر جب چھانے لگے
ہم قفس سے سر کو ٹکرانے لگے
آہ اور وہ بھی کسی مظلوم کی
دل تو دل ہے عرش تھرّانے لگے

صدا لگانے ترے در پہ تو گئے تھے مگر
ہم اپنے ہی دلِ بیتاب کو پکار آئے

کشاکش میں امید و یاس کی میرا سفینہ ہے
کہ ٹکراتا ہے ساحل سے اگر بچتا ہے طوفاں سے

ہر ادا اُن کی مسیحا بھی ہے اور قاتل بھی ہے
اب تو مر جانا ہمیں آساں بھی ہے مشکل بھی ہے

خون سے صفحۂ گردوں پہ رقم ہوتا ہے
عبرتِ کون و مکاں قصۂ غم ہوتا ہے
کاروانِ دلِ بیتاب کو لوٹا کس نے
دیر سے شور فغاں تا بہ حرم ہوتا ہے
غیر کے ہنسنے کی آتی نہیں کانوں میں صدا
شاید اب ذکر مرا بزم میں کم ہوتا ہے
سیکڑوں وادیِ ایمن ہیں ترے کوچے میں
لَو نکلتی ہے جہاں نقش قدم ہوتا ہے

ہر چمکتے ہوئے ذرے کی طرف جھکتا ہوں
مجھ کو دیوانہ کیا شوقِ جبیں سائی نے
تا بہ زنداں اثرِ جوشِ بہار آ پہنچا
وہ کیا چاک گریباں ترے سودائی نے
ناصری قبر پہ عبرت کے لئے لکھوا دو
طول کھینچا ہے یہاں تک شبِ تنہائی نے

مجھے امید ہے کہ ناصری، خوش گو و خوش فکر ناصری کا یہ مجموعۂ کلام

اُن کی بہترین یادگار ثابت ہوگا اور قبول عام اس پر بقائے دوام کی مہر ثبت کریگا۔

یہ مقدمہ جس سے ناصری کے کلام پر روشنی پڑنے کے بجائے میری بے مایگی ثابت ہوتی ہے اُن کی اس رباعی پر ختم کرتا ہوں ؎

دولت جسے کہتے ہیں سخا تیری ہے
جنت بھی فقط ایک عطا تیری ہے
پھیرا ہے فقیروں کا ترے در پہ کریم
مل جائے وہی جس میں رضا تیری ہے

ان کے ایک لایق شاگرد سید اعجاز حسین صاحب لکچرار یونیورسٹی الہ آباد نے تاریخ کہی ہے جس کا مادہ تاریخ یہ ہے:۔

ناصری خلد بریں کو پہونچے
۱۳۴۹ھ

اثر

رائے بریلی ۲۴ دسمبر ۱۹۳۱ء

NASIRI : A MEMOIR

MAHDI HUSAIN NASIRI was born in Lucknow in the year 1885. At the age of fourteen he passed the Middle English examination from the Husainabad High School; in 1901 the Entrance examination of the Punjab University. Financial circumstances made him give up his studies as a regular college undergraduate, but he appeared privately at the Intermediate examination of the Allahabad University in 1910, in the same year in which he passed the Mulla test. He passed the Fazil examination the next year. In 1907 he joined the staff of the Isabella Thoburn College as Persian teacher. He appeared privately at the B.A. examination of the Allahabad University in 1913, with Arabic and Hebrew as his optional subjects, and passed in the second division. In 1914 he joined the Persian-Arabic staff of the Muir Central College. In 1916, he completed his University education by taking the Master's degree. In July, 1922, he was appointed to the Provincial Education Service and transferred as Headmaster to the Government High School, Bijnor. From 1924 to 1929 he was Headmaster of the Barabanki School, and from 1929 to 1931 of the Aligarh Government High School.

In the year 1915 he became a Fellow of the Allahabad University, and till the end he was closely associated with it, as a member of the Court, Faculty of Arts, and several Committees of Courses. He had been, since its institution, a valued member of the Board of Intermediate and High School Education, and of its Persian, Curriculum, and Examination Committees. He was one of the first members of the Council of the Hindustani Academy; of the Vernacular Scientific Society; of the Shia College Board of Trustees; of the Courts of the Lucknow and Aligarh Universities. He had been a member of the Committees of the Allahabad Public Library and University Library.

He learnt the Holy Quran at the feet of Qazi Ali Jan and Qazi Muhammad Mahdi; *Khushnawisi* (beautiful handwriting) he learnt from Munshi Mir Masoom Ali, and Ashraf Ali Sahib; culture and refinement he acquired from Maulana Nasir Husain Sahib Mujtahid. Maulvi Zahurul Hasan taught him Arabic, but for his wide scholarship and catholic leanings he was indebted to the Hon. Justice Syed Karamat Husain. He knew German and Hebrew in addition to English, Persian and Arabic.

His earliest literary work, entitled *Sarware Ambia*, was a Urdu rendering of Carlyle's, "The Hero as Prophet." Among his other works were: *Makhzanul Fawaid*, a Persian grammar; *Hararat*, a Urdu text-book on heat; *Zeenate Wahsho Tair*, a Urdu treatise on sexual life among animals; *Sanadeede Ajam*, a history of Persian literature; *Mansur ki Sarguzasht*, a story translated from German. These have all been published. His *Qasaid* will shortly come out.

On March 23, 1931, he had a stroke of paralysis on the right side. He was recovering from it, when on May 11 he had a second attack, this time on the left side. This proved fatal, and he died on May 13 (24 Zilhejah 1349 A.H.). His body was brought to Fatehpur, Barabanki, where it was buried in the Imambara.

* * * *

I was a student of the Muir College when Maulvi Nasiri came on its staff, and though I was not a member of any of his classes, he was good enough to evince an interest in my studies. When three years later, entirely unforeseen and only half-welcome accident took me also to the teaching staff, Nasiri continued his old kindness and, before many months were over, allowed me the privileges of an equal. The years as they passed strengthened our friendship: my esteem and admiration kept increasing, and his generous appreciation continued unabated. Long absence made no difference. Only a few days after his first attack I visited him on official business. Though ill and ordered to be in bed, he was ready to receive me, most solicitous of my comfort, considerate as ever of my scruples, gay and genial and hospitable. And now I attempt to tell what he was and what he did; of his services to learning

and education; of his literary achievements; of his genius for friendship. If in the telling I seem to indulge in the language of extravagance, my abiding respect for his memory must be the excuse.

* * *

Whether in the class-room, expounding the intricacies of Arabic grammar or enlarging on the beauties of Persian poetry; whether in *mushairas* charming everybody by his exquisite verses; whether in a *majlis* discoursing on some religious topic; or whether in a small circle bubbling over with wit and good nature and knowledge—wherever he was and in whatever work he was engaged, Nasiri was remarkable and out of the common. At academic gatherings he was always fearless and independent; on all communal matters he was liberal; in committees his advice was practical and constructive. Rarely did he lose his temper; once or twice he did show impatience with too persistent an obstructionist, and now and then he allowed himself the relief of good-natured sarcasm. But never have I heard him ascribe base motives to an opponent. I have attended religious gatherings addressed by him: he was one of the most attractive and persuasive Urdu speakers I have ever heard. He held sovereign sway over the emotions of his listeners, now moving them to a mood of exaltation, again melting their thoughts into tears. Nor did he use any of the false tricks of the rhetorician; never did he depart from the recorded facts, nor did any one ever hear from his lips an unkind word about other faiths. No student ever willingly absented himself from his lectures; illustration, exposition, criticism were all so cleverly interwoven with anecdote, fun and drollery that his pupils acquired knowledge and learning without realising the fact and without having to endure the painful process insisted on by many a dry-as-dust teacher. But the memories that will endure longest are those of quiet afternoon talks, surveying the entire field of human interests, revealing the depth of his scholarship and his real character. His sweet reasonableness and persuasiveness were all his own. On many topics he spoke with knowledge and insight. And he was a good listener: he never monopolised talk;

he could relish a joke against himself ; his laugh was genuine and hearty. Little did I realise, when I met him in April, 1931, that I was seeing him for the last time. In the normal course he had before him many more years of useful activity. That was not to be. The Fates, in their wisdom, willed otherwise. And they know best.

* * *

Urdu lyric seemed during the last half of the nineteenth century to have reached its highest flights and sounded its subtlest depths. It seemed evident that in order to enjoy a continuity of healthy growth it must seek fresh woods and new channels. Mir, Ghalib, Atish, Nasikh, Dagh, seemed to have explored all its possibilities. Every turn of idiom, every source of allusion, every nicety of emotion, every shade and hue and depth of sentiment, seemed to have been used up. The *ghazal* seemed to have before it only an inane, tired, straggling course before losing itself in desert sand. Reformers prophesied its end in no uncertain terms. Other verse-forms were recommended. But the *ghazal* has persisted : it continues to be practised more than any other form. There are living poets who have succeeded in imparting freshness and charm and beauty to the *ghazal*, who practise it with as much skill as the old masters, and who have the authentic note of the genuine singer. Not yet is the fount of inspiration dry : some day the effect will be strained, the words mechanical, the feelings affected. "But ah ! not yet, not yet !"

Nasiri sat at the feet of the well-known Lucknow poet, Pyare Sahib 'Rashīd'; and he wrote his first verses at the age of fourteen : "he lisp'd in numbers for the numbers came." It was a happy chance that took him to Rashid, for the old poet was remarkable for the ease and flow of his verse and for the spontaneity of his expression. Here are a few of his lines:

(۱) خاک حسرت لے گئے، دل ہائے ویراں لے گئے،
آپ کے دیوانے ساتھ اپنے بیاباں لے گئے،

(۲) کبھی بجلی بھی گرے یاں تو عجب سے پوچھیں
آج کیا تھا جو سوئے گور غریباں آئی

(۳) دل ہی ڈوبے بھی ڈبوئے بھی بچائے بھی رشید

یہی کشتی - یہی دریا ہے - یہی لنگر ہے

(۴) کیا سبب ہے کیوں تڑپتی ہیں قفس میں بلبلیں

دیکھ اے صیاد گلشن کی ہوا آئی نہ ہو

From Rashid he learnt clarity and directness; but all the graces of his poetry are his own. A careful study of his *Diwan* will show that the qualities in which he excels are deep pathos, a sense of longing and striving and despair; a sensitiveness to the voice of nature; a gift of word-painting; and a firm conviction of 'the sense of tears in things human.' There seems a curious contradiction between the buoyancy of his own nature and the sad tone of his verse; who that saw him in his moods of gay irresponsibility could detect the undercurrent of despondency and dejection? He had striven successfully to carve out a career for himself; he was prosperous; he was widely esteemed; he was the head of a happy family. Who can plumb the deep recesses of the human heart? Only when he read his verses aloud could one listen, as coming from a distance, to a faint sound, a vibration, a break indicative of pain, of langour, of yearning for one knew not what, an aspiring after something far-off, something divine, some forgotten dream or some tempting illusion. The themes are old but eternal. Rarely does Nasiri strain after effect, and rarely is he futile.

Scenic effect is cleverly produced in several of his verses. This is a comparatively rare achievement in Urdu *ghazals*, and it is difficult. Frequently, too, he succeeds—to use Fox's phrase about Scott—in doing by means of words what the painter does by means of colour. The vivid delineation of a scene or the pictorial representation of a mood is Nasiri's especial forte.

(۱) اف یہ گھنگھور گھٹائیں یہ امنگیں دل کی

ہاے یہ جوش جوانی! یہ تقاضاے بہار

(۲) آسماں پر ابر جب چھانے لگے
ہم قفس سے سر کو ٹکرانے لگے

(۳) برسات ختم ہو گئی - بادل برس گئے،
رو جائے جس طرح سے کوئی دل بھرا ہوا

(۴) یہ فصل گل یہ بجلی کا کڑکن
بچانا آشیاں میرا خدایا

(۵) جھلملاتا ہوا تارا شب غم کا ڈوبا
دل کے ماتم میں سحر چاک گریباں ہو جائے

(۶) میں نے چنے جو گل ترے بستر کے واسطے
کیا جانے یار! غنچے نے کیوں مسکرا دیا

(۷) نگاہیں نیچی ہیں آنکھوں سے اشک جاری ہے
کسی غریب کو وہ قبر میں اتار آئے

(۸) کفن ہٹایا ہے چہرے سے قبر میں ہم نے
کہ شاید اب تو نظر صورت قرار آئے

I draw attention next to his love lyrics. Here again the subject is as old as Adam and in the opinion of the wise moderns as dead as Queen Anne. But even Touchstone assures us he has been a lover; and as long as man has to be content with an earthly physical image of his dreams, so long will he worship the rose treasured up within his heart and give himself up to longing, despair and ecstasy, not necessarily for that which he can get but always for that which he aspires to be united with. Love of human beauty or love of divine grace—who can tell? And it is at best but a faint line that divides the two. "And yet I love a kind of light, and of melody and of fragrance, a kind of food, and a manner of embracement, when I love my God; the embracement, food, fragrance, melody, and light of my man; where there shineth unto my soul what space containeth not, and there soundeth what time

snatcheth not, and there smelleth what breath disperseth not, and there tasteth what eating cloyeth not and there clingeth what satiety divorceth not. This is it which I love when I love my God." Saint Augustine utters here a word of sovereign wisdom. Let the reader decide, each one for himself, whether the poet longs for a human beloved or for the divine cup-bearer. The poet keeps his secret to himself.

(۱) داستاں گو نے سنایا حال قیس
کیا کہوں کیا کیا خیال آنے لگے

(۲) نہ پوچھو کس نے مارا. بیٹھا یارو ادھر آؤ
دکھائیں تم کو اک تصویر اپنی چشم حیراں میں

(۳) دل جب سے میں نے آپ کے قبضے میں دیدیا
مجبوریوں میں شان ہے ہر اختیار کا

(۴) ہجر کی شب ایک میں ہوں اک دل ناکام ہے
مردنی چھائی ہوئی ہے اور خدا کا نام ہے

(۵) ناز تھا یا صبر تھا تا تو قریب دل نہ تھا
کیوں نہ دیکھا دیکھنا تیرا اگر مشکل نہ تھا

(۶) پھڑکتے ہیں نیچی نگاہوں کے گھائل
اٹھالے نظر اے حیا کرنیوالے

(۷) ہر اک کو حال دل رو کر سنایا
نہ پہچانا ذرا اپنا پرایا

(۸) کشاکش میں امید و یاس کی میرا سفینہ ہے
کہ ٹکراتا ہے ساحل سے اگر بچتا ہے طوفاں سے

(۹) ادھر بھی اک نظر اے سیر صحرا دیکھنے والے
یہ تنہائی اور اتنی بے رخی گور غریباں سے

(۱۰) تمہیں دیکھو کہ دنیا کیا تماشا گاہ عبرت ہے
میں اور باتیں کروں پھروں چراغ شام ہجراں سے

(۱۱) عجب انداز سے ای ناصری دل نے بٹھایا ہے
قیامت تک نہ اٹھینگے زمین کوے جاناں سے

(۱۲) وہ بلا نصیب ہے دل مرا جسے ہجر و وصل سب ایک ہیں
نہ اندھیری رات میں نیند ہے - نہ ہے چین زلف دراز میں

(۱۳) فلک سے ٹوٹ کے تارے سر مزار آئے
اندھیری رات میں یہ تم کسے پکار آئے

(۱۴) صدا لگانے ترے در پہ تو گئے تھے مگر
ہم اپنے ہی دل بیتاب کو پکار آئے

Then there are occasional moods of depression and of weariness, when death comes like a welcome guest and oblivion is greeted with a smile. Life's aches prove too heavy and burdensome; suspense and disappointment come in unchanging succession; tears and sorrow and separation make existence a sore trial. What is one to wait for? The cup of life has been drained to the dregs: bitterness is the main taste in the mouth. And yet memory summons sweet scenes of long ago.

(۱) ایک عالم میں بسر کرتے ہیں ہم اور بلبل
کوئی رسواے جہاں ہے کوئی رسواے بہار

(۲) موت کی نیند جب آئی مری قسمت جاگی
بال کھولے کوئی آتا ہے عزا خانے میں

(۳) عبرت ہے شب غم میں تاروں پہ نظر کرنا
جل جل کے فنا ہونا مر مر کے سحر کرنا

(۴) بیٹھا ہے تھک کے وادی غربت میں دل مرا
اے موت مل لے میرے غریب الدیار سے

(۵) نالے کی اب ہوس ہے نہ حسرت ہے آہ کی
کیسی ہوا چلی کہ مرا دل بجھا دیا

(۶) ای چراغ کنج فرقت آج تو ہی ساتھ دے
دل مرا بجھنے لگا اور ابتدائے شام ہے

(۷) سیر دریا دیکھنے والے ہم بھی یاد آئے کہیں
کوئی ٹکرایا سفینہ کیا لب ساحل نہ تھا

(۸) ناصری قبر پہ عبرت کیلئے لکھوادو
طول کھینچا ہے یہاں تک شب تنہائی نے

Finally I select some verses which express his criticism of life, short maxims that compress a world of meaning, phases of mystic thought and mystic rapture beautifully expressed—

(۱) باقی رہے جو ہوش تو جوش شباب کیا
دل میں بہار ہو تو سبو کیا شراب کیا

(۲) مضطرب روح کوئی آگئی میخانے میں
خود بخود مئے کو ہے گردش مرے پیمانے میں

(۳) کبھی مسجد میں پکارا کبھی بتخانے میں
ہوش کی باتیں ہیں ساری ترے دیوانے میں

(۴) نیند کیا ہے موت کی اک لہر وہ بھی بے ثبات
موت کیا ہے ایک گہری نیند جو مشہور ہے

(۵) مرکے آنکھیں ہوئیں روشن ترے جلوے دیکھے
زندگی نام تھا شاید شب تنہائی کا

But the most satisfactory means of getting to know the poet is a careful perusal of his work. My task has been a melancholy one. As I have looked through his manuscript and seen the work through the press I have been conscious of my unworthiness: Nasiri had planned to supervise the publication himself and to inscribe each copy with a Persian *rubai.* I am pleased that I am enabled to render this service to his memory, so that as he himself would say:

خیر اتنی مری تعظیم کئے جاتے ہیں

AMARANATHA JHA

November, *1932.*

دیوانِ اوّل

(۲۴ - جنوری ۱۹۲۵ء)

حسن ہر شے کو دیا انجمن آرائی نے
لاکھ جلوے کئے پیدا تری یکتائی نے

دم فنا ہو گیا چھوڑا جو شکیبائی نے
مار ڈالا ہمیں آخر شبِ تنہائی نے

ہم نہ کہتے تھے کہ دیوانوں سے اچھی نہیں چھیڑ
خونِ دل کر دیا ظالم تری خودرائی نے

ہر چمکتے ہوئے ذرے کی طرف جھکتا ہوں
مجھکو دیوانہ کیا ذوقِ جبیں سائی نے

دامنِ گل بھی ہوا چاک دلِ بلبل بھی
ہر طرح فتنہ گری کی تری رعنائی نے

کیفیت اور ہی - اب عرضِ تمنا کیسی
پی لیا جامِ فنا تیرے تمنائی نے

دلِ سوزاں کو ذرا دیر سنبھالے رہتا
مفت شکوہ کیا نظروں کا تماشائی نے

چادریں آکے بگولوں نے چڑھائیں اکثر
موت روشن کی مری بادیہ پیمائی نے

جو ہوا صاعقۂ طور سے پورا نہ کلیم
وہ لیا کام تصور سے تماشائی نے

وہ مرے نالے وہ افلاک کا تھرا جانا
حشر دکھلا دیا طولِ شبِ تنہائی نے

تا بہ زنداں اثرِ جوشِ بہار آپہنچا
وہ کیا چاک گریباں ترے سودائی نے

اب تو ہنگامۂ محشر کا خدا حافظ ہے
قصد بڑھنے کا کیا ہے مری رسوائی نے

دل مرا جانبِ پیمانہ کھنچا جاتا ہے
توبہ توڑ ڈالی ہے ساقی تری انگڑائی نے

ناصری قبر پہ عبرت کیلئے لکھوا دو
طول کھینچا ہے یہاں تک شبِ تنہائی نے

معذرت

یاد ایام کہ تھی شوخ طبیعت میری
اور لب دوست پہ رہتی تھی حکایت میری
اب یہ عالم ہے کہ وارفتہ و مدہوش ہوں مَیں
خود مرے حال پہ روتی ہے طبیعت میری
نہ تو گویا ہوں نہ خاموش رہا جاتا ہے
قابلِ رحم ہے اے دوستو حالت میری
میری آشفتہ بیانی کا نہ چرچا کرنا
نظرِ غیر میں کیوں آئے ندامت میری
مَیں کہاں شعر کہاں بات فقط اِتنی ہے
تابِ خاطر شکنی لائی نہ غیرت میری

۱۱۔ ربیع الاول ۱۳۲۳ھ

جاں اپنی وقفِ زحمتِ ہجراں کئے ہوئے
عاشق ہر اک بلا کو ہیں مہماں کئے ہوئے

سب منتشر ہیں میرے جنازے کو دیکھ کر
تم ساتھ ہو جو بال پریشاں کئے ہوئے

اب تو نفس کی آمد و شد بھی ہوئی ہے بند
ایسی جگہ ہے سینے میں پیکاں کئے ہوئے

کس واسطے یہ محویتِ آئینہ دیکھ کر
کیوں آپ اک جہاں کو ہیں حیراں کئے ہوئے

ہنگامِ احتضار ہے اے دم ذرا ٹھہر
اِس وقت ہوں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے

ان مشکلوں پہ سب کی تن آسانیاں فدا
جن کو تری نگاہ ہو آساں کئے ہوئے

مجمع کا خوف روزِ قیامت ہے ناصری
بیکار ہو وصال کا ارماں کئے ہوئے

۹- مئی ۱۹۰۸ء

مدعائے اثرِ الفتِ پنہاں نکلا
لے کے ہمراہ مرا دل ترا پیکاں نکلا
آج کس نے غمِ دُنیا سے رہائی پائی
کون کوچے سے ترے چاک گریباں نکلا
اُٹھ گیا خیر مَیں ارمان لئے دُنیا سے
آپ کے دل کا تو ارمان مری جان نکلا
ذبح کر کے مجھے کیا جانئے کیا یاد آیا
قتل گہ سے مرا قاتل بھی پشیماں نکلا
صاف ظاہر ہے جو ہے خانۂ زنجیر اُداس
مَر کے زنداں سے کوئی بے سروساماں نکلا
دفعتاً کردئے سفّاک نے لاکھوں ٹکڑے
دَم بھی نکلا مرے دل کا تو پریشاں نکلا
اپنے کوچے میں جسے تم نے کیا تھا پامال
یہی وہ دل تھا نہ جسکا کوئی ارماں نکلا
ناصریؔ پائی نہ فرصت کہ غزل کہتے خوب
حوصلہ کچھ نہ سرِ بزمِ سخنداں نکلا

۱۷- مئی ۱۹۰۸ء

صبر امتحانِ عشق میں بالکل نہ ہو سکا
جب درد اُٹھا تو دل سے تحمّل نہ ہو سکا
سوزِ جگر کا ضبط تو بالکل نہ ہو سکا
وہ آگ لگ گئی کہ تحمّل نہ ہو سکا
کیا دل نے دی خبر کہ چلے آئے لاش پر
کُچھ دیر اور تم سے تغافل نہ ہو سکا
گُل تو شگفتہ ہو گئے بادِ بہار سے
لیکن علاج حسرتِ بُلبل نہ ہو سکا
اِن قافیوں میں کہہ تو لئے شعر ناصری
لیکن ذرا بھی ہم سے تغزل نہ ہو سکا

۱۱ ستمبر ۱۹۰۹ء

جا عجب کی ہے مری موت کا ساماں ہونا
آپ کے تارِ نظر کو تھا رگِ جاں ہونا

صبح کے ساتھ مرا چاک گریباں ہونا
تیرا جانا تھا کہ عالم کا پریشاں ہونا

کیا کہیں ہم کو تو دن رات لہو رونا ہے
ہو مبارک دہنِ زخم کو خنداں ہونا

مَیں تڑپتا ہوں تم آؤ کہ اجل کو بھیجو
چاہیئے کچھ تو مرے درد کا درماں ہونا

ہیں اکیلے۔ غمِ فرقت سے ہے ہر بار یہ حال
آپ مرنا ہمیں اور آپ ہی گریاں ہونا

دل چھٹا۔ صبر گیا۔ ہوش چلے۔ دَم نکلا
کیا قیامت ہے اسیرِ غمِ ہجراں ہونا

بن چکی زلف بس آئینہ کو رکھ اے خود بیں
کون دیکھے ترا حیران و پریشاں ہونا

ہر جگہ آگ نہ لگ جائے کہیں دُنیا میں
تُو پریشاں نہ بہت اے دلِ سوزاں ہونا

ابتدا عشق کی اور ناصری احباب سے شرم
آج ممکن ہے علاجِ غمِ پنہاں ہونا

۱۴- مئی سنہ ۱۹۰۹ء

اے رخصتِ شباب غمِ جانگزا دیا
آخر جو رات تھی تو مجھے کیوں جگا دیا

میں کیا بتاؤں نزع نے کیا کیا مزا دیا
افسانۂ فراق سُنا کر سُلا دیا

مجنوں بنایا دشت نوردی میں مَوت دی
بس رفتہ رفتہ خاک میں تم نے ملا دیا

منکر ہوا جو تیغِ جفا کی وہ کاٹ کا
میں نے بھی سینہ چاک کیا دل دِکھا دیا

میں نے جو گُل چُنے ترے بستر کے واسطے
کیا جانے یار غُنچے نے کیوں مُسکرا دیا

یاد آگئی کسی کے پرِ تیر کی ہَوا
بادِ صبا نے آ کے مرا دل اُڑا دیا

نالے کی اب ہوس ہے نہ حسرت ہے آہ کی
کیسی ہَوا چلی کہ مرا دل بجھا دیا

اے ناصری کسی کا وہ خلوت میں بیٹھنا
ہاں ایک خواب تھا جسے ہم نے بھلا دیا

۲۸- اکتوبر ۱۹۰۹ء

دیکھ تو فرقت میں کیا حالِ دلِ پُرغم ہوا
رات بھر سینے میں اے ظالم بڑا ماتم ہوا

دل کے مرنے سے جہاں کب درہم وبرہم ہوا
سینہ کوبی میں نے کی اتنا فقط ماتم ہوا

طاقتِ فریاد آئی کچھ عجب عالم ہوا
لو قیامت آگئی دردِ جگر پھر کم ہوا

ٹانکے ٹوٹے زخمِ دل کے بڑھ گیا جوشِ جنوں
کھل گئیں کلیاں بہار آئی نیا عالم ہوا

سچ تو ہے ہمسایہ کی آفت سے ہوتی ہے گزند
تیر سینے پر لگا دل کا عجب عالم ہوا

سخت جانی سے مری تو بھی خجل ہوگا ضرور
دیکھ اے قاتل تری تلوار کا سر خم ہوا

بال کیوں کھولے حسینوں نے بڑھیں کیوں سوئیاں
مجھکو تو رونا ہے اِسکا کیوں مرا ماتم ہوا

۲۹ - اکتوبر ۱۹۱۰ء

قتالِ خلقِ حسن ہے اِس فتنہ ساز کا
دیکھا جسے شہید تھا وہ تیغ ناز کا

دل سوز کوئی ہو تو سُنے دل کا ماجرا
کس کو سُنائیں حال غمِ جانگداز کا

پروانے بھی جلا گئے شمعیں بھی بزم میں
ہنگامہ دیکھتے رہے ہم سوز و ساز کا

ایسا لگا ہے تیر کہ قابو میں دل نہیں
دیوانہ بن گیا نگہِ فتنہ ساز کا

اُترے وہ آپ شانہ ہلانے کو قبر میں
ہٹ جائیں سب کہ وقت ہے راز و نیاز کا

آنکھوں میں دم ہے در پہ نظر جام ہاتھ میں
اب تک ہے انتظار اُسی مست ناز کا

آئیں بلائیں ہجر کی راتیں بھی کٹ گئیں
نقشہ کھنچا رہا تری زلفِ دراز کا

جب سے یقین مژدۂ رجعت ہے ناصری
رہتا ہوں منتظر کرم کارساز کا

شعبان سنہ ۱۳۳۰ھ

اِس ستمگار نے سیکھا ہے خفا ہو جانا
کیا قیامت ہوا نالوں کا رسا ہو جانا

نزع میں بڑھکے کھٹک دل سے یہی کہتی ہے
آج تو درد کا ممکن ہے دوا ہو جانا

لے کے پیغام قضا بادِ بہاری آئی
نامبارک ہوا زخموں کا ہرا ہو جانا

عرش تھرّائیگا اغیار کے دل ٹوٹیں گے
نالہ کرتا ہوں مگر تم نہ خفا ہو جانا

دم نکلنا ہے یہی جان کا جانا ہے یہی
دل کا آساں نہیں پہلو سے جدا ہو جانا

پسِ مردن بھی رہے خانۂ زنجیر میں پاؤں
اس طرح چاہیے پابندِ وفا ہو جانا

زلزلے آ کے زمانے کو خبر دیتے ہیں
نہیں ممکن تپشِ دل کا فنا ہو جانا

جان لے جائیگا اور درد بڑھا جائیگا
ہاتھ تیرا مرے سینے سے جدا ہو جانا

ابھی بیٹھے رہو میں دیکھ رہا ہوں تم کو
نزع کے وقت گلے مل کے جدا ہو جانا

سمجھو کس درجہ ہے سوزِ غمِ الفت دشوار
دیکھ پروانوں کا جل جل کے فنا ہو جانا

زہر بھر دیتا ہے زخموں میں دلِ وحشی کے
فصلِ باراں میں بیاباں کا ہرا ہو جانا

ناصرؔی پھر وہی ہم ہیں وہی شوریدہ سری
پھر وہی حاضرِ بزمِ شعرا ہو جانا

۱۳۔ شعبان ۱۳۲۴ھ

مرے دل کا مرے آگے جو کوئی نام لیتا تھا
تڑپ بڑھ جاتی تھی اور میں کلیجہ تھام لیتا تھا
سُنی تھی شب کو میں نے بھی صدا غیروں کے ہنسنے کی
تمھاری بزم میں کوئی تو میرا نام لیتا تھا
شبِ فرقت میں اتنا بیخودی کا مجھ پہ عالم تھا
کوئی کچھ پوچھتا تھا مَیں تمھارا نام لیتا تھا
تمھارا نام لینا تھا تو کچھ تسکین ہوتی تھی
مرے دل کو کوئی ہاتھوں سے گویا تھام لیتا تھا

۶۔ شوال ۱۳۲۴ھ

قربان ہے سو جان سے تم پر گِلہ کیسا
دیکھو تو مرے دل نے کیا حوصلہ کیسا
ہوتا ہے مگر قید کوئی آپ کا وحشی
سُنئے تو ہے زنداں کی طرف غلغلہ کیسا
ہاں شدّتِ دردِ جگری بزم میں لائی
دل مر گیا اے دوست تو پھر ولولہ کیسا
تو نے تو کہا ہے مَیں رگِ جاں سے قریں ہوں
اور ہجر کا ہے قول کہ یہ فاصلہ کیسا
مر جائیگا پابندِ وفا ظلم نہ چھوڑو
میں قصّۂ دل کہتا ہوں لے جاں گِلہ کیسا

۳۰- جون ۱۹۰۹ء

آنکھوں سے خوں رواں ہوا دفتر اُلٹ گیا
اب اور ضبط کیا ہو کلیجہ تو پھٹ گیا

وحشت بڑھی جو طاقتِ دیدار آگئی
تم نے نقاب اُلٹی مرا دل اُلٹ گیا

آتی ہے بو لہو کی کچھ اشکوں سے آجکل
شاید ہمارے دل کا کوئی زخم پھٹ گیا

بیکس وہ ہوں کہ میری رگِ جاں نہ کٹ سکی
ہاتھوں سے اُن کے تیغ کا ڈورا لپٹ گیا

میں نے غزل جو میر کی اس بحر میں سُنی
اے ناصری وہ زورِ طبیعت کا گھٹ گیا

۱۵- اپریل ۱۹۰۹ء

دلِ بیتاب سا ہمدرد تو کوئی نہ ہوا
یہی وہ ہے جو کبھی درد سے خالی نہ ہوا

مر کے ہر طرح کی آفت سے بچا لے موسیٰ
خیریت گذری کہ میں محوِ تجلّی نہ ہوا

کس بلا کا تھا مزا ہائے مرے نالوں میں
میں تڑپتا رہا وہ قتل پہ راضی نہ ہوا

ناصری ہجر سے بچنے کو بقولِ غالب
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

۲۷ - نومبر ۱۹۰۹ء

مزا دیتا ہے حسن و عشق کا یوں نام کر جانا
ترا بالیں پہ آنا میرا دنیا سے گذر جانا
جوانی تک اُٹھا فرقت کے صدمے پھر گذر جانا
ابھی باقی ہے شب اے دل سحر ہولے تو مر جانا
اثر ہے عشق کا اے چارہ گر مرہم سے کیا ہوگا
قیامت تک نہیں ممکن جگر کا زخم بھر جانا
نہ دیکھا کس قدر جانبازیوں کے بعد ٹوٹا ہے
غضب ہے میرے دل کا تیری نظروں سے اُتر جانا
لکھی سب داستانِ عشق ہاں اک بات باقی ہے
ٹھہر قاصد مرے مرنے کی بھی لے کر خبر جانا
وفا کا خاتمہ ہے اک نظر دیکھو تو مر جاؤں
مآلِ زندگانی ہے جہاں میں نام کر جانا

۷- مئی سنہ ۱۹۰۸ء مطابق ۵- ربیع الثانی سنہ ۱۳۲۶ھ

میں گرا بیہوش ہو کے مضمحل دل ہو گیا
آپ کیا رخصت ہوئے جینا بھی مشکل ہو گیا

کس لئے قلبِ حزیں کو چھیڑتے ہو بار بار
کب سے افسانہ مرا سننے کے قابل ہو گیا

عشق کی ناکامیاں رو رو کے سمجھانے لگا
آج ناصح بھی ہمیں لوگوں میں شامل ہو گیا

کیا اثر تھا خونِ بسمل نے جو دی بوئے وفا
ہاتھ سے خنجر گرا بیتاب قاتل ہو گیا

۳۰- رجب سنہ ۱۳۲۵ھ

کی ادھر پھر کے نظر غیر سے ساغر مانگا
مجھ سے دل آپ نے مانگا بھی تو کیونکر مانگا

آج تو قہر کیا ناز سے کیں دو باتیں
دل و جاں دونوں کو ظالم نے برابر مانگا

بارِ احساں سے جھکا جاتا ہوں اور شرم بھی ہے
سر بزانو ہوں کہ کیوں غیر سے خنجر مانگا

زینتِ بزمِ طرب کے لئے اللہ اللہ
آج اُس بُت نے ہمارا دلِ مضطر مانگا

رجب ۱۳۲۵ھ

جان کے ساتھ رنج اور غم تھا
مر گئے جب تو اور عالم تھا

مرگیا شاید آپ کا وحشی
آج زنداں میں شور کچھ کم تھا

چل بسا ناصرؔی دلِ بیمار
شب کو سینے میں شورِ ماتم تھا

ہر کس و ناکس پہ اب تم مہرباں ہونے لگے
کیا خبر تھی آہ کا ایسا اثر ہو جائے گا

آہ کرتے ہیں بتاؤ اُس پہ بھی ہو گا اثر
ہم سے مانا اک جہاں زیر و زبر ہو جائے گا

رہروانِ وادیِ الفت کو کیا ڈر ناصرؔی
ہم پہ جو ہونا ہے وہ المختصر ہو جائے گا

۱۲۔ شعبان ۱۳۲۲ھ

ذرا دیکھو نہ دیکھے کوئی جلوہ روئے روشن کا
میانِ حشر پردہ کرکے آؤ اپنے دامن کا

رہے ارمان دل میں ساتھ چھوٹا روح سے تن کا
کھُلا مدفن میں آکر فرق ہم کو دوست دشمن کا

وہ ایذائیں وہ تنہائی وہ پہلی رات تُربت کی
وہ تاریکی لحد کی اور وہ بُجھنا شمعِ مدفن کا

ہمارے ضعف سے حدِ جنوں بھی بڑھ نہیں سکتی
مِلا چاکِ گریباں سے نہ اک دن چاک دامن کا

حد ہوئی تیرے تغافل کی ہمارے ضبط کی
بس بس اے ظالم کلیجہ مُنہ کو اب آنے لگا

نالے کئے زمانے میں بدنام ہو چُکا
بس تجھ سے ضبط اے دلِ ناکام ہو چُکا

۱۔ جولائی ۱۹۰۹ء

کھِلے ہیں زخم جگر قلب داغدار ہیں آج
ہمارے باغ میں دیکھو عجب بہار ہے آج

۵ - ذیقعدہ ۱۳۲۴ھ

کیا کہوں مَیں کس ادا سے جانِ قاتل لے گیا
میرے لاشے سے صدا آنے لگی دل لے گیا

ہوش تو اتنا نہ تھا جو سوئے قاتل لے گیا
کچھ تو یاد آتا ہے ہاں شاید مجھے دل لے گیا

تو نے اے رنگِ وفا حسرت نکالی بعد قتل
خون کی چھینٹوں کو تا دامانِ قاتل لے گیا

حسرت اے جوشِ جنوں اُس ناتواں وحشی کی کیا
تا گریباں ہاتھ جو اپنا بہ مشکل لے گیا

تم سمجھتے تھے مسیحا جس کو اے اہلِ جہاں
باتوں باتوں میں وہی ظالم مرا دل لے گیا

پہلے لایا بزم میں پھر جان کی نذرِ ادا
جذبۂ دل قبر تک منزل بہ منزل لے گیا

اے خدا تو ہی رگِ جاں کی حفاظت کیجیو
تیغ کے ڈورے کی جانب ہاتھ قاتل لے گیا

پوچھتا ہوں میں جگر سے درد کا باعث ہے کیا
سینے سے آواز آتی ہے کوئی دل لے گیا

۲۲۔ جون سنہ ۱۹۰۶ء مطابق ۱۲۔ شعبان سنہ ۱۳۲۵ھ

باتوں باتوں میں کیا خوں آج اک دلگیر کا
واہ کیا کہنا تری رنگینیِ تقریر کا

بے سبب کب ہے تڑپنا عاشقِ دلگیر کا
سینے سے پیکاں نکلتا ہے تمھارے تیر کا

نو گرفتاروں کی وحشت کا بھی ہو کچھ امتحاں
آج سُننا چاہیے نالہ نئی زنجیر کا

باعثِ حیرت ہوا بیمارئ دل کا اثر
دیکھو اب تو رنگ اُڑتا ہے مری تصویر کا

بس بس اے ظالم کہاں تک امتحانِ ضبطِ آہ
اب تو دم گھُٹنے لگا ہے عاشقِ دلگیر کا

مر گیا ہے آپ کا وحشی اُداسی چھائی ہے
دیدنی ہے آج عالم خانۂ زنجیر کا

دل بھی دھڑکا آپ کا زلفیں بھی بل کھانے لگیں
اور ابھی زنداں میں نالہ ہے مری زنجیر کا

۲۲۔ شوال ۱۳۲۴ھ

کچھ بتا تو سہی کیا گذری ہے دل پر قاصد
حُسنِ جاناں کا نظارہ ہوا کیونکر قاصد
محفلِ یار کی زینت تو بیاں کر مجھ سے
دیکھے ہونگے دلِ پُر داغ بھی اکثر قاصد
کسی بیکس پہ کرم کرتے بھی پایا تھا اُسے
یا بپا دیکھا تھا ہنگامۂ محشر قاصد
راہ میں کتنے شہیدوں کے پڑے تھے لاشے
سُنتا ہوں تو لئے پھرتا ہے وہ خنجر قاصد
حالتِ زار بیاں کی تو ہنسا تھا سُن کر
رنج یا کرتا تھا مجھ پر مرا دلبر قاصد
ہجر میں روتا ہوں دل کا نہیں ملتا ہے پتہ
تو نے دیکھا ہو وہاں گر تو بیاں کر قاصد
تو نہ پہچانتا ہو گر تو نشاں بتلادوں
داغ اور آبلے اُس پر ہیں سراسر قاصد
خیر جا تو بھی میں بیہوش ہوا چاہتا ہوں
ہائے افسوس فراقِ دل و دلبر قاصد
ناصرؔی پوچھ چکا حال مگر حیرت ہے
حُسنِ جاناں کا نظارہ ہوا کیونکر قاصد

۲۰- مئی سنہ ۱۹۰۸ء ۱۸- ربیع الثانی سنہ ۱۳۲۶ھ

کوئی کہدے مرے عیسیٰ سے جاکر
مریضِ ہجر کی کچھ تو دوا کر

نیا ہے بزم میں تیرا تکلّف
کہ بیٹھا مجھ کو دُنیا سے اُٹھاکر

دلِ اہلِ عدم میں درد اُٹھّا
قیامت آپ نے کی مسکراکر

کیا بیخود ستمگر نے سرِ بزم
اُٹھایا مجھ کو دیوانہ بناکر

تڑپ کر آہ کی اور مرگیا میں
تمھیں کیا مل گیا آخر ستاکر

کوئی چلّا رہا ہے جان لے لے
مگر ظالم نہ دل مجھ سے جدا کر

ہمیں بھی جام دے چپکے سے ساقی
حریفوں کی ذرا نظریں بچاکر

رگِ گردن پہ ہے شمشیرِ قاتل
بس اب تو ناصری یادِ خدا کر

۹- جون ۱۹۰۶ء

نہ پوچھو کس طرح حالِ دلِ دیوانہ کہتے ہیں
ہزاروں آرزوئیں ہیں جو مایوسانہ کہتے ہیں

زباں بہکے تو بہکے قصۂ رندانہ کہتے ہیں
کہ ایسی لغزشوں کو لغزشِ مستانہ کہتے ہیں

جو کچھ آپس میں شب بھر شمع اور پروانہ کہتے ہیں
اکیلے آپ کے عاشق وہی افسانہ کہتے ہیں

قیامت ہے کہ جس گھر کی ہو زینت خونِ حسرت سے
اسی کو سب مری امید کا کاشانہ کہتے ہیں

عجب عبرت فزا ہے بیکسی فرقت نصیبوں کی
کہ اپنے دل سے اپنا رات بھر افسانہ کہتے ہیں

کبھی وصلت کا ارماں ہے کبھی مرنے کی خواہش ہے
بتا تو ہی اسے کیا اے دلِ دیوانہ کہتے ہیں

کہاں وہ اور کہاں دل ہاں چمک سی ایک اُٹھتی ہے
اسی کو دوستو ہم جلوۂ جانانہ کہتے ہیں

یہاں قسمت کی گردش ناصریؔ کب جانے دیتی ہے
عبث سب میرے آگے قصۂ میخانہ کہتے ہیں

۲۲ - جمادی الاول سنہ ۱۳۲۴ھ

قتل میں کوئی شریکِ غمِ بیداد نہیں
کیا کہیں آج ہی اپنا دلِ ناشاد نہیں

تو جلا کر ہمیں غیروں کو ہنسا دیتا ہے
ورنہ کوئی بھی تری بزم میں دل شاد نہیں

واں کے ذرّے بھی ہیں عاشق کے جگر کے ٹکڑے
کون دل ہے جو ترے کوچے میں آباد نہیں

ناصری بادشہِ ملکِ مضا میں ہے رشید
رنج کیا خلق میں ناسخ سا جو اُستاد نہیں

کیا رگِ جاں سے نہیں نزدیک خالق ناصری
کچھ گلے میں صورتِ زنّار آتا ہے نظر

آنکھ سے آنسو ہوئے جاری اُٹھا طوفانِ غم
شامِ فرقت آئی اور ہونے لگا سامانِ غم

۲۴- شعبان ۱۳۲۴ھ

اپنے قابو میں نہیں باقی رہا دل ان دنوں
یا الٰہی پڑ گئی کیسی یہ مشکل ان دنوں

محو رہتا ہے تصوّر میں کسی کے یا ہے ضعف
شور کم کرتا ہے پابندِ سلاسل ان دنوں

کنجِ تنہائی میں پہروں رہتا ہوں خاموش میں
ہاں مگر باتیں کیا کرتا ہے کچھ دل ان دنوں

قیدِ زنداں میں ترے وحشی نے شاید جان دی
بند ہے کچھ شورِ زنجیر و سلاسل ان دنوں

سرگرانی بڑھ گئی لو آ گئی فصلِ بہار
اور چھیڑے گا مجھے شورِ عنادل ان دنوں

۶۔شوال ۱۳۲۴ھ

دلبر کا کیا گلہ کوئی غمخوار بھی نہیں
پہلو میں آج تو دلِ بیمار بھی نہیں

مرنا وہ جس کو حیلۂ آزار بھی نہیں
قاتل وہ جس کے ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

تسکینِ دل محال ہے حالت کہے بغیر
اس پر ستم کہ طاقتِ گفتار بھی نہیں

محوِ جمال ہو کے مروں آرزو یہ ہے
حالت یہ ہے کہ طاقتِ دیدار بھی نہیں

اللہ رے اعتبار اداؤ نگاہ پر
مقتل میں آئے ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

۷۔ مئی ۱۹۰۸ء مطابق ۵۔ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ

زخم جب سینۂ سوزاں کے ہوا دیتے ہیں
آگ اک سارے زمانے میں لگا دیتے ہیں

یوں سکھاتے ہیں ستم پیشہ نشست و برخاست
درد اُٹھا دیتے ہیں اور دل کو بٹھا دیتے ہیں

چونک اے بخت وہ نالے کئے عاشق نے شروع
سونے والوں کو جو عالم میں جگا دیتے ہیں

چاہتے ہیں نہ کوئی پاس رہے جز حسرت
روز وہ شمع لحد آ کے بُجھا دیتے ہیں

اس میں کیا اپنی خطا آپ سنیں یا نہ سنیں
ہم تو احوال دلِ زار سُنا دیتے ہیں

مجھ کو دم توڑتے دیکھا تو زیادہ ہے کرم
مشکل آسان ہو اِس کی یہ دعا دیتے ہیں

میرے دل ان سے نہ دعوائے محبت کرنا
ایسی باتوں پہ وہ دیوانہ بنا دیتے ہیں

ناصری مشق چھٹی جب تو گیا لطف غزل
پہلے کی طرح کہاں شعر مزا دیتے ہیں

۲۱- جون ۱۹۰۸ء

ہم تو محروم کرم ہو کے کہیں کے نہ رہے
کہ نہ بیہوش ہیں ساقی نہ ہیں ہشیاروں میں

قافلہ اہل محبت کا گیا سوے عدم
کوئی باقی نہ رہا آپ کے بیماروں میں

آئیں پیمانے کی گردش کا تماشا دیکھیں
جن کو دعویٰ ہے کہ ہم لوگ ہیں ہشیاروں میں

اب تو ہر خُم سے اُبلنے لگی مے اے ساقی
کوئی تو تشنہ دہن ہے ترے میخواروں میں

میرے زنداں کو تصور نے کیا آئینہ بند
تیری صورت نظر آنے لگی دیواروں میں

ناصری وعظ سُنی ہے تو بہکتے ہو بہت
آؤ دم بھر کے لئے چلتے ہو میخواروں میں

۱۷ مئی ۱۹۰۸ء مطابق ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ

اب کوئی ارمان کوئی حوصلہ باقی نہیں
دل نہیں باقی تو کوئی مشغلہ باقی نہیں

ہر گھڑی تھا شور جسکے دم سے وہ دل مرگیا
جس میں سوزش تھی بہت وہ آبلہ باقی نہیں

تم رگِ جاں سے مری نزدیک ہو سنتا ہوں میں
مجھکو بھی تسکین ہے گر فاصلہ باقی نہیں

تم پیاپے چھیڑ کر جسکو رُلاتے تھے مجھے
سینے میں اب وہ دل پُر آبلہ باقی نہیں

قتل کر قاتل مجھے بس اب کوئی حسرت نہیں
زندگی سے موت بہتر جب تجھے الفت نہیں

سوگواری سے بچیں ایسی کوئی صورت نہیں
دل جہاں زندہ رہے وہ وادی الفت نہیں

جانے والے اک تماشا دیکھ لے مُنہ پھیر کر
عالم حسرت کا نقشہ ہے مری تربت نہیں

کوئی نیرنگِ جفا دیکھنے جائے نہ وہاں
کہ وہ ہشیاروں کو دیوانہ بنا لیتے ہیں

دل مرچکا ہے کس سے کہیں داستانِ عشق
اب تو کوئی جہان میں ہمراز ہی نہیں

۳-جون ۱۹۰۹ء

ناصری قیس کی روح آج ذرا شاد کرو
فصلِ گل آئی چلو نجد کو آباد کرو

کبھی کچھ مجھکو بھی ارمان تھے کیوں بھول گئے
کبھی دل تھا مرے پہلو میں ذرا یاد کرو

آؤ بیٹھو دلِ گستاخ کا شکوہ ہے عبث
ایسی بھولی ہوئی باتوں کو نہ اب یاد کرو

ناصری خوف ہے گھُٹ گھُٹ کے نہ مر جاؤ کہیں
چپ ہو کس واسطے نالہ کرو فریاد کرو

جو ہو ہمدرد حالِ چشمِ گریاں دیکھتے جاؤ
مرے دریائے غم میں سیرِ طوفاں دیکھتے جاؤ

سرِ راہ آکے بیٹھا ہوں کئے ہیں داغِ دل روشن
شبِ غم آ گئی ہے سیرِ چراغاں دیکھتے جاؤ

خرامِ ناز سے گر چاہتے ہو حشر برپا ہو
تو میں بھی چاک کرتا ہوں گریباں دیکھتے جاؤ

ہمیں سر پھوڑتے پایا چلے تم سیر کیا دیکھی
ذرا گلکاریِ دیوارِ زنداں دیکھتے جاؤ

۲۰ شعبان ۱۳۴۷ھ

یوں مبتلا کسی پہ کوئی اے خدا نہ ہو
دل دے دیا ہو اور امیدِ وفا نہ ہو

تم بے نیاز ہو تو ہے قہر اس غریب پر
جس کا بجز تمھارے کوئی آسرا نہ ہو

محوِ خرام آپ ہیں بیچین اہلِ قبر
مجھکو یہ خوف ہے کہ قیامت بپا نہ ہو

صدمے اُٹھائے ہیں تو دُعا ہے یہ ناصری
ان ظالموں پہ کوئی بشر مبتلا نہ ہو

توڑتا ہوں دم سرِ بالیں ہجومِ عام ہے
یا الٰہی مجھ سا رسوائے جہاں کوئی نہ ہو

جی میں اپنے آج کل ہے مثلِ غالب ناصری
رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

دل جلایا داغِ ناکامی دیا
واہ اے شامِ جوانی کیوں نہ ہو

ہجر میں رویا ہوں برسوں ناصری
پھر طبیعت میں روانی کیوں نہ ہو

---

۲۵ جون سنہ ۱۹۰۶ء ۳-رجب سنہ ۱۳۲۴ھ

عشق زلفِ دوتا کیا میں نے
دل اسیرِ بلا کیا میں نے

دل کو صبر آزما کیا میں نے
سچ تو یہ ہے بُرا کیا میں نے

ذکرِ غم جا بجا کیا میں نے
بیقراری میں کیا کیا میں نے

تجھکو ہمدم سمجھ کے حال کہا
کیا ستم ناصحا کیا میں نے

مجھکو میرا ہی دل ستاتا ہے
امتحاں بارہا کیا میں نے

عشق میں کیوں عذابِ ناکامی
کیا گناہ اے خدا کیا میں نے

جان کیوں ساتھ چھوڑے جاتی ہے
دے دیا دل تو کیا کیا میں نے

کچھ تو پائی تھی درد میں لذّت
دل جو نذرِ جفا کیا میں نے

شب کو ہونے لگی چمک دل میں
یاد اسے جب ذرا کیا میں نے

ناصری عاشقی ہے آفتِ جاں
رو رہا ہوں کہ کیا کیا میں نے

۲۵- شعبان ۱۳۲۴ھ

اک قیامت ہے بپا شورِ دلِ دلگیر سے
اُڑ گئے ٹکڑے فلک کے آہ کی تاثیر سے

رازِ الفت کے عیاں ہونے کا ڈر جاتا رہا
خامُشی سیکھی ہے ہم نے بلبلِ تصویر سے

چھیڑتا ہے کس لئے ناصح اسیرِ زلف کو
دم اُلجھتا ہے تری اُلجھی ہوئی تقریر سے

کس کا دل زخمی کیا تو نے ستمگر کیا کیا
خوں ٹپکتا ہے لبِ سوفار و نوکِ تیر سے

خوف کیا گر ہوگا مجمع روزِ حشر اے ناصرؔی
میں اسے پہچان لونگا خونِ دامنگیر سے

۲۸ - شعبان ۱۳۲۴ھ

نالے کرتا ہوں میں اک حشر بپا ہوتا ہے
بڑھ گیا درد جگر دیکھئے کیا ہوتا ہے

میں سمجھتا ہوں کہ پھر کوئی مصیبت آئی
درد جب میرے کلیجے میں سوا ہوتا ہے

ناصح اچھّا تھا جو ہمدرد مرا تو ہوتا
کیا بتاؤں تجھے کیا غم میں مزا ہوتا ہے

تو نے دیکھا تو ہوا دل ہدفِ تیرِ نگاہ
رحم میں بھی ترے اندازِ جفا ہوتا ہے

دل کی تسکین کی صورت شبِ فرقت میں نہیں
کوئی تدبیر کروں درد سوا ہوتا ہے

وصل ممکن نہیں ہے موت کا آنا باقی
ناصری دیکھئے کب فضلِ خدا ہوتا ہے

۲۹ شعبان ۱۳۲۴ھ

لگا تیر ترچھی نظر کرنے والے
کہ حاضر ہیں دل کو سپر کرنے والے

ہزار آفریں تیرے قلب و جگر پر
جدائی کی راتیں بسر کرنے والے

زمانے میں لائیں گے تازہ قیامت
مرے چند نالے اثر کرنے والے

لگاتے ہیں شرما کے کیوں تیر دل پر
ستاتے ہیں ترچھی نظر کرنے والے

بڑھا ضعف جب سے کہاں ہیں وہ نالے
زمانے کو غم کی خبر کرنے والے

بجز شمع ہے ناصری کون مونس
کہ جل جل کے ہیں ہم سحر کرنے والے

۳۱۔ جون سنہ ۱۹۰۸ء ۱۴۔ شوال سنہ ۱۳۲۶ھ

یاس و حسرت درد و غم ان سب کی منزل ایک ہے
بیکسی میں آفتیں اتنی ہیں اور دل ایک ہے

وحشتِ قیس اور میرے غم کا حاصل ایک ہے
واقعے اکثر جدا ہیں حسرتِ دل ایک ہے

حالتِ قلب و جگر دیکھی یہ تیرے ہجر میں
جان سے اک جا چکا ہے نیم بسمل ایک ہے

بزمِ جاناں میں بہت جاتا تھا دل یادش بخیر
یعنی اس گُم گشتہ کے ملنے کی محفل ایک ہے

زندگی کیوں ساتھ دے جب دور تم ہم سے ہوئے
جانکنی کا حال اور فرقت کی منزل ایک ہے

اب سوا کنجِ لحد کے عافیت ممکن نہیں
ناصری اپنے لئے راحت کی منزل ایک ہے

۸۔ رجب ۱۳۲۵ھ

میں تو عاجز ہوں تمھیں پوچھو دلِ ناکام سے
کیوں تڑپ جاتا ہے سینے میں تمھارے نام سے

سب پئیں ساقی رہیں محروم ہم اک جام سے
ہوگئی برگشتہ قسمت گردشِ ایّام سے

ہجر کی زحمت سے آغازِ جوانی میں مرے
تھک گئے تھے ہم کچھ ایسی نیند آئی شام سے

غیر کی تشنیع کا ہم دے نہیں سکتے جواب
خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں دلِ ناکام سے

صرف بیداری ہے اپنی عمر اے سودائے عشق
نیند آئے قبر میں شاید ہمیں آرام سے

جانتے ہیں خوب اُس پیماں شکن کو ناصری
دل بہل جاتا ہے لیکن نامہ و پیغام سے

۱۲ - رجب ۱۳۲۵ھ

یاد آتی ہے مجھے جب خوش بیانی آپ کی
کچھ نئی لفظوں میں کہتا ہوں کہانی آپ کی

آپ نے پروا نہ کی مَیں قید ہستی سے چھُٹا
مہربانی ہوگئی نامہربانی آپ کی

قتل کی ضد ہے نزاکت سے نہیں اُٹھتی ہے تیغ
دیدنی ہے آج تو شانِ جوانی آپ کی

جاننے والوں سے پردہ اسقدر بیکار ہے
حُسن ظاہر سب پہ اور یہ لن ترانی آپ کی

مرنے والے کرکے آنکھیں بند قبروں میں گئے
واہ وا کس شان سے آئی جوانی آپ کی

داغ الفت اس لئے سینے میں رکھّا ہے نہاں
کوئی میرے پاس کیوں دیکھے نشانی آپ کی

۱۳- رجب ۱۳۲۴ھ

تعلّق کون رکھتا ہے مری جاں مرغ بسمل سے
تڑپنے دیجئے سینے میں کیا کام آپ کو دل سے
نکلتا آپ کا پیکاں بھلا کیوں کر مرے دل سے
مری جاں گوشت سے ناخن جدا ہوتا ہے مشکل سے
مجھے بیدل بنا کر کیوں اُٹھایا اپنی محفل سے
ابھی یہ ناز کی باتیں تھیں کس دلگیر کے دل سے
جوانی آگئی اور دل نہ پہنچا عشق کی حد تک
ہوئی شام اور مسافر رہ گیا دور اپنی منزل سے
نہیں معلوم کب خونِ تمنا کر گیا ظالم
ہوا ظاہر جو رونے کی صدا آئی مرے دل سے
لُٹا کر خرمنِ ہستی حیاتِ جاوداں پائی
ہوئی شاداب کشتِ عمر آبِ تیغ قاتل سے
شفق تو شام ہی سے کہہ رہی تھی ہونگے خوں لاکھوں
صدائیں رات بھر رونے کی آئیں کوئے قاتل سے
غضب ہے غیر تو لبریز پائیں جام اے ساقی
ہم آنسو بھر کے آنکھوں میں یونہیں اُٹھ آئے محفل سے

۲. شعبان ۱۳۲۵ھ

فتنہ گر تجھ سے جو اُلفت ہو جائے
حشر آ جائے قیامت ہو جائے

آپ کیوں میری حکایت سُنئے
کہیں یہ بھی نہ شکایت ہو جائے

تم کو دعویٰ ہے جفا کاری کا
آج میری بھی شہادت ہو جائے

اب تو اِک نالہ کریں گے ہم بھی
گو کہ دُنیا میں قیامت ہو جائے

ناصرؔی مشق غزل گوئی کر
کہ عیاں زورِ طبیعت ہو جائے

۶. شعبان ۱۳۲۵ھ

دوبارہ زیست کہیں غم میں مبتلا نہ کرے
وہ ساتھ غیر کے ہوں حشر میں خدا نہ کرے

اُداس ہوں کہ مرا دل نہیں ہے پہلو میں
مری طرح کوئی مغموم ہو خدا نہ کرے

سمجھ میں آئے جو برگشتگی مقدّر کی
مریض آپ کا مرنے کی بھی دُعا نہ کرے

جفا جو چاہے کرے ناصرؔی وہ دل آزار
کسی غریب سے دل کو مگر جدُا نہ کرے

۷۔شعبان ۱۳۲۵ھ

دل دھڑکنے لگا فریاد کی نوبت آئی
تم چلے اُٹھ کے مری جان قیامت آئی

آپ کے ظلم نے دی میری وفا کو شہرت
کہ مرے خون سے بھی بوئے محبّت آئی

سچ ہے مرنے پہ نہیں کوئی کسی کا دل سوز
شمع بھی بُجھ گئی جس دم سرِ تربت آئی

آہ سے میری زمیں ہل گئی تارے ٹوٹے
مَیں یہ سمجھا کہ زمانے میں قیامت آئی

مُسکراتے ہوئے دُنیا سے گئے اہلِ وفا
جان دیدینے سے چہرے پہ بشاشت آئی

۹۔ شعبان ۱۳۲۵ھ

عجب انداز سے تم گھر کے باہر اے صنم نکلے
ہزاروں ہو گئے بیہوش اور لاکھوں کے دم نکلے

تری محفل سے جب نکلے بصد رنج و الم نکلے
عجب ہے پھر تجھی پر چاہنے والوں کے دم نکلے

چُھٹے گا خون کا دھبّہ ندامت تو نہ جائے گی
قیامت تک کبھی جو خنجرِ قاتل سے خم نکلے

دلِ پُر داغ نے گو کی بہت ہنگامہ آرائی
قیامت خیز لیکن آپ کے نقشِ قدم نکلے

نہیں جب لکھنؤ تو ناصری کیا لطف جینے کا
وطن سے ہم بسانِ رہروِ ملکِ عدم نکلے

۱۰۔ شعبان ۱۳۲۵ھ

ساقیا مل لے گلے دیکھ گھٹا چھائی ہے
عید ہے بادہ پرستوں میں بہار آئی ہے

نزع میں ہوں مگر اے موت ٹھہر جا دم بھر
وہ بھی آلیں جنھیں دعوائے مسیحائی ہے

خیریت سے دلِ بیمار کو یارب رکھنا
کہ ابھی درد سے رونے کی صدا آئی ہے

جانے کیا جان فدا کر کے ہوئی رسوائی
ساری دنیا مرے لاشے کی تماشائی ہے

۱۸- ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ

اے داغِ جگر کس لئے اب جلوہ گری ہے
بیمار شبِ ہجر چراغِ سحری ہے
دیکھا ہے جو پیراہنِ گُل چاک چمن میں
دیوانوں کے دل میں ہوسِ جامہ دری ہے
مرتے ہی چلے جاتے ہیں سب دیکھنے والے
تیری وہی نازش وہی بیدادگری ہے
اس مرحلۂ عشق میں اللہ بچائے
راہیں ہیں خطرناک مرا دل سفری ہے
بھرتے ہوئے آہیں جو گئے دنیا سے وحشی
برباد گلستاں میں نسیمِ سحری ہے
اُف اُف کی صدا آئی جنازے سے بھی میرے
دیکھو تو کلیجے میں یہ کیا آگ بھری ہے

۲۱- ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ

۲۳ مئی ۱۹۰۸ء

جفا کرتے ہیں یوں جفا کرنے والے
کہ ہیں دم بخود سب گلا کرنے والے

ذرا بیٹھ جا میرے پہلو میں آ کر
مرے دل کو مجھ سے جدا کرنے والے

شبِ غم ہے در بند ہیں آسماں کے
کہ بیمار ہیں کچھ دعا کرنے والے

مرے تن میں یوں درد پھیلا ہوا ہے
پریشان ہیں سب دوا کرنے والے

خود اپنا گلا آج کیوں کاٹتا ہوں
سمجھ لیں گے خونِ وفا کرنے والے

پھڑکتے ہیں نیچی نگاہوں کے گھائل
اُٹھا لے نظر او حیا کرنے والے

وہی ناصری بتکدے میں ہیں بیخود
بڑے تھے جو یادِ خدا کرنے والے

۲۴ - ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ

۲۶ - مئی ۱۹۰۸ء

کس طرح زخمی کیا تم نے نگاہِ ناز سے
رات بھر رویا کیا دل درد کی آواز سے
میرے دل کو تم نے چھیڑا کچھ عجب انداز سے
رنگ محفل بڑھ گیا اس ساز کی آواز سے
دیکھتے ہیں وہ رخِ بیمار اس انداز سے
دل دھڑکتا ہے شکستِ رنگ کی آواز سے
سامنے آکوئی کہدے اس قدر انداز سے
دیکھ دل بڑھتے ہیں تیرے تیر کی آواز سے
آج یہ راہِ جنوں میں کس نے رکھا ہے قدم
ہل گیا سارا جہاں زنجیر کی آواز سے
بے پری سے رہ گئی بلبل کی ساری آرزو
در قفس کے وا ہیں اور مجبور ہے پرواز سے

اس قدر صدمہ ہوا رنگِ گلستاں اُڑ گیا
پر شکستہ بُلبلوں کی حسرتِ پرواز سے

دیکھ کر جلوہ بھلا کیا ہوش میں رہتے کلیم
دل تو ٹکڑے ہو چکا تھا اک نئی آواز سے

دیکھنا ہے اس مہم میں کس طرح کرتا ہے صبر
امتحاں دل کا وہ لینگے پانوں کی آواز سے

موت کی ہے نیند سوتے ہیں شہیدانِ وفا
تو صدا دے جاگ اُٹھیں شاید تری آواز سے

بزم میں ان کی گیا دل ناصریؔ میں بھی سنوں
آج کیا کرتے ہیں باتیں وہ مرے ہمراز سے

۱۳- جمادی الاوّل ۱۳۲۶ھ

خاطر شبِ غم اے دلِ ناشاد کریں گے
ہمراہ ترے نالۂ و فریاد کریں گے

سودائے محبّت میں گئی جان ہماری
اے شامِ جوانی تجھے کیا یاد کریں گے

اے دل نئے زخموں سے نیا لطف ملے گا
ہاں خوب سنبھل جا کہ وہ بیداد کریں گے

محشر میں جو دم نکلیں گے آمد پہ کسی کی
ہم خنجرِ قاتل کو بہت یاد کریں گے

ملتا ہے مرے دل سے مزا حسن و وفا کا
مر جائے گا تو آپ بہت یاد کریں گے

کہہ کہہ کے شبِ ہجر میں یہ جان کو روکا
اب کی نئے انداز سے فریاد کریں گے

اے ناصری اچّھا تو کوئی شعر نہ نکلا
احباب غزل یہ مری کیا یاد کریں گے

۱۸- ربیع الاول ۱۳۲۷ھ

۱۰- اپریل ۱۹۰۹ء

ہے سُرخ خون سے جتنا غبار راہ میں ہے
کسی شہید کا شاید مزار راہ میں ہے

گھٹا کو دیکھ کے کیوں لائے جائیں جام وسبو
ابھی تو شاہدِ فصلِ بہار راہ میں ہے

قدم تک آئیں گے گیسو تو جان دیدیں گے
ابھی ہماری شبِ انتظار راہ میں ہے

میں انتظار کے صدمے سے توڑتا ہوں دم
مہک صبا کی یہ کہتی ہے یار راہ میں ہے

سنبھل سنبھل کے چلو کوئے یار میں یارو
قدم قدم پہ دلِ داغدار راہ میں ہے

لہو کی بو ہے بگولوں میں قافلے والو
ذرا بتاؤ یہ کیسا غبار راہ میں ہے

۱۲- جون ۱۹۰۹ء

نہ تو موت آتی ہے ہم کو نہ سحر ہوتی ہے
دیکھیں کس طرح شبِ ہجر بسر ہوتی ہے
سر بکف کوچۂ قاتل کی طرف جاتا ہوں
لیجئے آج مہم عشق کی سر ہوتی ہے
میں بھی مرتا ہوں شبِ ہجر بھی ہوتی ہے تمام
نزع کا وقت ہے گل شمع سحر ہوتی ہے
شام سے آکے مرے فرش پہ آرام کیا
یہ نہ پوچھا تری کس طرح بسر ہوتی ہے
ان کی آمد ہے۔ سوا ہے تپشِ دل ہر دم
جب بڑھاتے ہیں قدم ہم کو خبر ہوتی ہے
ناصریؔ گردشِ قسمت کا عبث ہے شکوہ
سچ تو ہے ایک طرح کس کی بسر ہوتی ہے

۱- جون ۱۹۰۹ء

ہر طرح تم نے بیوفائی کی
حد بھی ہے صبر آزمائی کی
دم نکل جائیں سو گلے کٹ جائیں
رات کٹتی نہیں جدائی کی
اپنے بندوں پہ ظلم کرتے ہیں
اِن بتوں نے نئی خدائی کی
ناصریؔ میر کی غزل جو سنی
فکر نے پھر نہ کچھ رسائی کی

۱۳- رجب ۱۳۳۰ھ

اسیروں نے کچھ ایسی آہ کھینچی قلب سوزاں سے
نکل آئے شرارے ہر در و دیوارِ زنداں سے

یہ سمجھے جب نظر آئی شفق یوسف کو زنداں سے
لہوتا دور پہنچا زخمِ قلبِ پیرِ کنعاں سے

چھپایا گیسوئے مشکیں نے انکے روئے تاباں کو
خجل ہونے لگی صبحِ وطن شامِ غریباں سے

تصوّر سے زلیخا کی نگہ نے راہ پیدا کی
نظر آتے ہیں یوسف روزنِ دیوارِ زنداں سے

عجب الفت ہے وحشت سے کہ وحشی تیرے کہتے ہیں
الٰہی حشر تک لپٹے رہیں صحرا کے داماں سے

عجب سطوت سے بے تکبیر کافر ذبح کرتا ہے
کہ آتی ہے صدا اللہ اکبر کی رگِ جاں سے

شبِ فرقت صدا آتی ہے میرے قلبِ پُر غم سے
تصوّر میں ہو کیوں خاموش کچھ باتیں کرو ہم سے

ہے جب سے دردِ دل نیرنگیِ عالم کو بھولے ہیں
غرض کچھ خندۂ گُل سے نہ مطلب اشکِ شبنم سے

یہ کہدو ناصرؔی کیوں چارہ گر زحمت اٹھاتے ہیں
نہ اچھا ہوگا بیمارِ محبت ابنِ مریم سے

۲- جولائی ۱۹۰۹ء

غم میں جینے سے طبیعت سیر ہے
جلد آ اے موت اب کیا دیر ہے
کل تپِ غم سے جہاں جلتا تھا میں
آج اُسی جا خاک کا اک ڈھیر ہے
تجھ تک آنا ہے حرم ہو یا کہ دیر
یہ فقط سب راستے کا پھیر ہے
بس ہٹا لو روے روشن سے نقاب
میری نظروں میں جہاں اندھیر ہے
ہر چمن سے یوں گل و بلبل گئے
پتّیوں کا اور پروں کا ڈھیر ہے
یا علی بیمارِ غم ہے ناصری
دیجئے جلدی شفا کیا دیر ہے

ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ

جاتا ہوں شوق مے کا میں دلبر لئے ہوئے
آنا مرے مزار پہ ساغر لئے ہوئے

پوچھو نہ کچھ کہ قبر میں گذرے ہیں کتنے دن
مدّت گذر گئی ہمیں یہ گھر لئے ہوئے

شاید گلوں نے ہو کے خفا کر لئے طلب
صیّاد ابھی گیا ہے مرے پر لئے ہوئے

سب ٹکڑے دل کے جمع کئے سُن کے شورِ حشر
اُٹھے لحد سے شوق کا دفتر لئے ہوئے

خونیں کفن تھے جسم میں دل داغدار ہے
جاتا ہوں اپنے قتل کا محضر لئے ہوئے

میں یاد کر کے عہدِ جنوں کو تڑپ گیا
آئے جو لوگ قبر پہ پتّھر لئے ہوئے

مل جائے دادِ شوقِ شہادت کی اے خدا
اُٹھّا ہے کوئی ہاتھ میں خنجر لئے ہوئے

قاتل سے پوچھ داورِ محشر یہ کون ہیں
قبروں سے نکلے ہاتھوں پہ جو سر لئے ہوئے

قسمت نے کل جہاں نہ دیا ساتھ ناصری
جاتے ہیں آج پھر وہیں بستر لئے ہوئے

در نعت حضرت سرور کائنات صلعم

ساز ہم آہنگ قرآنِ مبیں داریم ما
زخمہ اش از شہپر روح الامیں داریم ما

آسماں را بیخودی و قدسیاں را دم کشی است
نغمہائے نعت خیر المرسلیں داریم ما

در گدائیہا ست بر ملکِ سلیماں خندہا
آستانِ مصطفےٰ زیر جبیں داریم ما

چوں شبِ معراج معمور است دل از حسنِ قدس
در شبِ غم یادِ زلفِ عنبریں داریم ما

ماو ماہِ آسماں را ناز بر داغِ دل است
سکۂ سلطانیِ سلطانِ دیں داریم ما

در فنائے ما صد اسرارِ بقا پوشیدہ اند
یادِ او ہمرازِ وقتِ واپسیں داریم ما

آں جلالت را کہ زیرِ عرش تقدیسش کنند
از جمالِ او سرِ فرشِ زمیں داریم ما

صفۂ لولاک جائے فکرِ درویشانِ اوست
پا بر افلاکیم و تارک بر زمیں داریم ما

مطلعے بر خوان برنگِ عاشقاں اے ناصری
مستیِ مے در شراب الصالحیں داریم ما

دیگر

برسرِ بالیں ترا ماتم نشیں داریم ما
وائے بر درد یکہ در قلبِ حزیں داریم ما

حسرتِ دل جاں شکار است و اسیرِ بندِ تست
طرفہ صیّادیست کانرا در کمیں داریم ما

از عرق افشانیِ ما لذّتِ اہلِ صفاست
موجۂ تسنیم در چینِ جبیں داریم ما

بے تو اے آرام جاں چوں رنگِ رخ دل ہم شکست
ہاں بیا! تا کے مکاں رابے مکیں داریم ما

نالہ زن آئیم چوں تسکیں پذیرد دردِ عشق
عشرت اندوزیم چوں دل را غمیں داریم ما

ماطپانیم و فروزاں ہر رگِ سنگِ مزار
آہ زاں آتش کہ در قلبِ حزیں داریم ما

عطسہ آید مغز ایماں را ز بوے داغِ دل
طعنہا بر نافۂ آہوئے چیں داریم ما

چہرہ ات بنمائی تا آید بکارِ ما نگاہ
اے کہ از خاکِ تو چشمِ سرگیں داریم ما

از مجازِ ما حقیقت جلوہ ریزد ناصری
در دلِ صد پارہ صد خلدِ بریں داریم ما

دیگر

نو بہار است کہ باراہ جنوں بر سازم
دلِ آوارہ کجا رفت کہ رہبر سازم

بہ تمنّائے بقا غرق مئے ناب شوم
در تہِ آتشِ تر کارِ سمندر سازم

گرہِ کارِ من از برِ آبلے بکشاید
بسکہ از خار پئے آبلہ بستہ سازم

من بہ میخانہ خمِ آبِ بقا بر شکنم
طرفہ ربطیست کہ با خضر و سکندر سازم

طلب رحم کنم از تو چو دیوانہ شوم
چوں بخود در رسمت بازِ ستمگر سازم

منکہ در کشتہ شدن رنگِ شہادت بینم
جادۂ راہِ بقا بر دمِ خنجر سازم

ایں سراسیمگی از جوشِ بہارست مرا
ورنہ صد برگ و لوا ورمہ و آذر سازم

پختہ بے آتشِ تر جام جہاں بیں نشود
خاکِ جمشید بکف آرم و ساغر سازم

ناصری خاکِ رہِ ساقیِ کوثر شدہ ام
کہ حریفاں خود ازا صبغ و قنبر سازم

دیگر

چیست این هنگامه کز منصور گفتارش کنی
هر که از رازِ تو گوید بر سرِ دارش کنی

بر مزارِ کشتهٔ خود اشکباری خوب نیست
برق ریز از خندها تا گرم بازارش کنی

نغمه از گل می سراید پیش رویت عندلیب
می سزد اے فتنه گر کاتش به منقارش کنی

سونش الماس باید ریخت بر زخمِ دلم
از نمک ریزی چرا تکلیف آزارش کنی

حیف بر روزے که میرد شمعِ مهر از دودِ آه
ناز بر آن شب که روز از تاب رخسارش کنی

این چه نیرنگست کاموزی نگاهِ ناز را
گاه دلدارش کنی گاهے دل آزارش کنی

دل که بر خود لرزد از افسانهٔ طور و کلیم
برق حسن آخر چسان حیران دیدارش کنی

جاں بلب آمد بیا تا مرگ دشوارم شود
خواب گیرد بخت من باید که بیدارش کنی

بسکه هم آهنگ عرفی و زلالی ناصری است
تا ز شیرازش بخوانی فخر خوانسارش کنی

قطعہ تاریخ وفات جناب ڈپٹی

علی اکبر صاحب مرحوم

الا اے ناصری بشنو چہ غوغائیست در دنیا
کہ ہر لب فاش گوید آہ آہ اے فتنہ گر دنیا
الا دل شد غمیں رویش جگر شد آتشیں رویش
مگر خیزد شغفت دنیا مگر ریزد شرر دنیا
فلک را ہم نشانے داد از سفّاکیِ عامش
کہ خوں آلود دارد چہرہ اش شام و سحر دنیا
زمیں را ہم ملالے داد از بیدردیِ طبعش
کہ از پا بر فگندش آہ نخلے پُر ثمر دنیا
ہما نا پر ثمر نخلش ہماں سید علی اکبر
کہ بہرِ مام گیتی داشتش فرخ پسر دنیا
پسر پوشید اکفانِ ثمین و مادرِ گیتی
زند ہمچوں ثواکل نالہ جانسوزِ در دنیا
ایا سلطان اہلِ علم ایا رضواں مآب من
بیا بنگر کہ نورت را نہاں کرد از نظر دنیا
تو در گلزار جنّت مائل سیر و تماشائی
ریاضت را ز نارِ غم فگند آتش بسر دنیا

بیا اے سرورِ دینم بیا بنگر غضنفر را
که خواندش در نیستانِ فضائل شیرِ نر دنیا

بدل بتخالہا دارد بہ لب صد نالہا دارد
غرض بد حالہا دار کہ گردش بے پدر دنیا

پئے سالِ وفاتش نوحہ خواں مثلِ حسینؑ خود
عفا پس از علیِ اکبرِ ما ہست بر دنیا
۱۳۲۷ھ

قطعہ تاریخ انتقال سید محمد ضامن صاحب مرحوم

ناصری حیف کہ سونی ہے ہماری محفل
ہو گئے مائلِ فردوس محمد ضامن

سالِ ہجری بھی ہوا تعمیہ نام و مقام
کہ ہوئے داخلِ فردوس محمد ضامن

تاریخ انتقال جناب خان بہادر علی عباد صاحب نیساںؔ
مرحوم و مغفور

یاد آیا ہے کہ دل تھا ساز و ساماں کی طرف
نظریں پڑتی تھیں ہماری ابرِ نیساں کی طرف
یا ہے اب روئے سخن قلبِ پُر ارماں کی طرف
کیوں کھنچا جاتا ہے تو شہرِ خموشاں کی طرف
کیا فقط یوسف ترا اے نیمجاں ملتا نہیں
اس نگر میں کارواں کا کارواں ملتا نہیں
مرکزِ شعر و سخن یہ شہر مدت تک رہا
شیخ ناسخؔ کے قدم سے دائرہ آباد تھا
پھر منیرؔ و رشکؔ کا بھی فیض یوں جاری ہوا
گوہرِ نظم آج تک پاتا رہا نشو و نما
یادگارِ رفتگاں سیّد علی عباد تھا
یعنی اب تک مسکنِ ناسخ الہ آباد تھا
حیف شاگردِ منیرِ نکتہ زا جاتا رہا
یا کہ اس بستی سے جلوہ نظم کا جاتا رہا
شور ہے بحرِ سخن کا آشنا جاتا رہا
مر گئے نیساںؔ کہ درِ بے بہا جاتا رہا

فصلِ نوروز و خزاں نے ہمکو مارا ہائے ہائے
ماہِ نیساں میں چھٹا نیساںؔ ہمارا ہائے ہائے

ہم سے پوچھو کس لئے جاتا رہا اس دل کا چین
فیضِ ناسخؔ سے تھی ہم دونوں کی ساری زیب و زین

ارتباطِ باہمی ثابت ہے بین المشرقین
ہم عدد بھی ہیں علی عباد اور مہدی حسین

یاد رکھ بحرِ سخن کے جب کنارے جائینگے
نام لے کر تجھے نیساںؔ پکارے جائینگے

بجھ گئی افسوس شمعِ ناسخؔ و رشکؔ و منیرؔ
مٹ گیا وہ خانداں جسکا نہیں ممکن نظیر

یوں تو روئے گا الہ آباد کا برنا و پیر
شعر کا ماتم کریں گے ہاں فقط ہم اور شہیرؔ

ناصرؔی دل خونچکاں سالِ وفاتش برزباں

آں علی عباد نیساںؔ خاں بہادر داد جاں

۱۳۳۵ھ

تاریخ وفات جناب حکیم مرزا محمد مہدی صاحب مرحوم

الا کہ قلزمِ آفات شد زمین و زماں
الا کہ ساحلِ عشرت زچشم گشت نہاں

فزود جوشِ حوادث بہ عالمِ امکاں
شکستہ کشتیِ عمر و جہاں پُر از طوفاں

زچار موج بلاہا مرا دہید اماں
پئے سپہر ز ابر است اشک باریہا

پئے زمانہ ز شبہاست سوگواریہا
برائے مادرِ گیتی است بیقراریہا

ہزار بار صدا می زند بہ زاریہا
زیوسفم ہلہ اے کارواں دہید نشاں

حکیم مہدی ما بود ماہ کنعانش
ہماں کہ گشت مسیحا بدور دورانش

بہند مرد و نجف گشت مسکنِ جانش
وفات یافت بہ عشقِ علیِ عمرانش

چو روز بست و یکم آمد از مہِ رمضاں

حکیم مہدی ما حجۃ الاطبا بود
که پیشوائے طبیبان خود مسیحا بود

ز فیضش آیتِ حکمت بہ من ہویدا بود
اگر غلط نہ کنم حجۃ الاطبا بود

کہ مقتدائے مسیح است مہدیِ دوراں
ہزار حیف کہ آں حجۃ الاطبا رفت

زمانہ جاں بلب است از غم و مسیحا رفت
چو بہرِ سال وفاتش سخن بہ لبہا رفت

بفکرِ ناصری ایں مصرع مصفّا رفت
ز مرگ مہدیِ من بے مسیح گشت جہاں

۱۳۲۵ھ

تاریخ انتقال شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم

چوں فرود آمد ز تختِ عاج شاہِ خاوری
لیلیٔ شب را پریشاں گشت زلفِ عنبری
شد مشبک سطحِ گردوں از سہامِ اختری
اختر دنبالہ دار آمد بہ چرخِ اخضری
گفت کاے خبر انشیناں گریہ چوں شبنم کنید
حلقۂ عیش و طرب را حلقۂ ماتم کنید
ایں فدائے جاں گزا آورد ماراد شکست
رونق محفل شکست و آہ سرتا سر شکست
شد مکدّر بزم عشرت شیشہ و ساغر شکست
چشم ما شد خونچکاں آرے دلِ مضطر شکست
سنگ حسرت بر سرِ دنیائے فانی بر زدیم
سینہ را بشگافتیم و بر جگر خنجر زدیم
نالہ سر کردیم کاخر سوز ہجراں داشتیم
دل پریشاں صورت زلفِ پریشاں داشتیم
تیر زہر آلود حسرت در رگِ جاں داشتیم
جانِ مضطر را بپادشاہ قرباں داشتیم

آں شہِ جم مرتبت کز گلشنِ دنیا گذشت
خونِ دل در ماتمش از آستین ما گذشت

ایڈورڈِ ہفتمیں شاہنشہ ذیشان ما
تاجدارِ ملک ما فغفور ما خاقانِ ما

نازشِ برطانیہ دارائے ہندوستان ما
صلح جوے و صلح کن در دورۂ دوران ما

رفت از اقلیم دہر و مسندِ شاہی گذاشت
ماتمِ مرگِ خودش از ماہ تا ماحی گذاشت

عبرتِ اہلِ جہاں از انقلابِ روزگار
آنکہ تا بد مہر بر ملکش ہمہ لیل و نہار

میر و وزیرِ زمیں بے مونس و بے غمگسار
عالمے در ماتمِ او بیقرار و اشکبار

ناصری سالِ وفاتش گفت باآہ و بکا
ایڈورڈِ ہفتمیں رفتہ سوے دار البقا

سنہ ۱۹۱۰ء

قطعہ تاریخ انتقال جناب سید محمد ضامن صاحب مرحوم

نظر کن گردشے اے مست صہبائے الست اینجا
کہ چرخ عزت و مجد و شرف گردید پست اینجا
محمد ضامن مرحوم محتاج محبت شد
امید فاتحہ دارد اگر مردے گذشت اینجا
کہ گوید سید مرحوم را بعد از وفات او
کہ ہر کس بہر او غم خورد و برہم سود دست اینجا
پیاپے تر کند باران رحمت خاک تربت را
بنا گردید مردے صلح جوئی و حق پرست اینجا
رقم زد ناصری در معجمہ تاریخ بر قبرش

مزار صلح جو سید محمد ضامن است اینجا

۱۰ شوال ۱۳۳۳ھ ۲۲ اگست ۱۹۱۵ء

قطعہ تاریخ انتقال زوجہ سید محمد ضامن صاحب مرحوم

آہ آں بانوئے خوش کردار کز روزِ الست
بود شیدائے حسینؑ و حق نما و حق پرست

در مہِ شعباں سفر کرد از وطن سبطِ رسول
رخت ہستی عاشقش از دہر در آں ماہ بست

داد اورا منزلے رضواں بہ گلزارِ جناں
حورِ جنّت نزدش آمد ساغرِ کوثر بدست

نقش زد سالِ وفاتش ناصری در معجمہ

ایں مزارِ زوجۂ پاکِ محمد ضامن است

۳۔ شعبان سنہ ۱۳۲۹ھ ، سنہ ۱۹۱۱ء

قطعہ تاریخ انتقال سید ضامن علی صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر
ولد سید جعفر علی صاحب مرحوم

یارب چہ ماتم است کہ صد نالہ و فغاں
تا گوش عرش میرسد از سطح خاکداں
گریاں زمانہ است و جانکاہ نعرہ ایست
ضامن علیِ نیک سیر رفت از جہاں
بنگر کہ نعش قطب شرف میرسد بہ قبر
روئے زمیں ز سطح فلک میدہد نشاں
کردند دفن طارم عزّ و جلال را
بنگر کہ زیر خاک نہاں گشت آسماں
سالِ وفات گفت بہ منقوطہ ناصری
ضامن علی بہ سوئے جناں آہ شد رواں
۵-ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ، ۱۰-جنوری ۱۹۰۸ء

تاریخ وفات جناب سید محمد اصطفیٰ صاحب

عرف لڈن صاحب خورشید مرحوم

آں محمد اصطفیٰ خورشید جر معتمد
صاحبِ فضل و کمال و صاحبِ علم و خرد

از عظیم آباد رفتہ سوئے گلزار ارم
دائما کانت علیہ رحمۃ اللہ الاحد

آفتابِ آسمانِ شاعری کردہ غروب
ہست گر مہرِ منوّر سر برہنہ می سزد

برد عمرِ خود بسر در مدح سلطانِ غریب
جاں بغربت داد و ذوقِ باطنش شد مستند

نقش زد سالِ وفاتش را بہ حسرت ناصری
حمیریؔ ہند رفتہ سوئے اللہ الصمد
۱۳۱۹ھ

قطعہ تاریخ وفات جناب منظور احمد صاحب مرحوم

فخر رزّاقیان بانسہ شریف
بود منظور احمد حق رس
کرد رحلت بہ غرۂ رمضاں
در غریبی گسست تار نفس

یافت مدفن بارض کھیرا گڈھ
۱۹۲۹ء
بے ابا سال عیسوی شد و بس
ناصری بہر سال ہجری گفت

آہ منظورِ احمدِ بے کس
۱۳۴۷ھ

تاریخ وفات جناب نعیمہ خاتون مرحومہ

آہ از دورِ گنبدِ دوّار
کہ شدہ دشمنِ سکون وقرار
کرد رحلت ادیبۂ کامل
در زمانِ شباب وفصلِ بہار
می خلد خارِ غم چناں در دل
کہ عزیزاں شدند سینہ فگار
آنکہ پُر نور خوابگاہے داشت
یافتہ مرقدے چہ تیرہ وتار
ناصری نقش زد بسنگ لحد
گشتہ مدفوں نعیمۂ دیندار

۱۳۴۹ھ

دیگر

آہ از گردشِ دوران و جفائے گردوں
بر دمیدند چہ گلہا کہ نگشتند زبوں
حیف آں زینتِ گلزار فصاحت جاں داد
کہ ز گلہائے ادب بود کلامش مشحوں
ہر کہ دل داشت شد از مرگ شبابش دل‌ریش
ہر کہ جاں داشت شد از ماتم مرگش محزوں
قمر برج فصاحت شدہ پنہاں از چشم
معدنِ فضل و کرم زیر زمیں شد مدفوں
ناصرؔی سال مسیحی سرِ قبرش بنوشت
اللہ اللہ بجنانست نعیمہ خاتون
سنہ ۱۹۳۰ء

تاریخ تالیف "صنادیدِ عجم"

ایں جلوۂ معنی کہ بقرطاس پدیداست
مہراست عجم را و عرب را مہ عیداست

نزدیک خدایانِ سخن بسکہ رسیدہ
شیرازۂ مجموعۂ من حبل وریداست

از گنجِ نغم مژدہ دہد بے خبراں را
ایں نظمِ گہرریز کہ آوازنشید است

نازم کہ حیاتِ ابدی یافتہ امروز
در مقتلِ عشاق ہرآنکس کہ شہید است

سالِ رقمش ناصری از کلکِ گہربار
بنوشت کہ آثارِ صنادید پدیداست
سنہ ۱۳۴۲ھ

بے حشو زعرفی شمر ایں سالِ رقم را
آثار پدیداست صنادیدِ عجم را
۳۱۴ + سنہ ۱۳۴۲ھ

قطعہ تاریخ وفات زوجہ جناب نواب بہا صاحب

قبلہ

بر٭وز جمعہ و بتاریخ ہفتدہم ز رجب

عروس باقرِ ذیجاہ از جہاں شدوائے

نوشت ناصرِیِ زار سال رحلت او

بسیزدہ صد و بست و نہم رواں شدوائے

۱۳۲۹ھ

٭ بروز جمعہ بتاریخ ۱۷ رجب المرجب ۱۳۲۹ھ وقت ۳ بجے ۴۰ منٹ قریب نماز صبح بعمر ۲۵ سال ۷ ماہ ۱۳ یوم۔

قطعہ تاریخ بنائے بیت عزا

نہ ایں شگفت زنیرنگ بزم امکانست
یزید بر سرِ تخت و حسین بے جانست

خدا است در دل و آں پارہ درغمِ شبیر
شہادتست عیاں خوں بہاش پنہانست

من و غم و دلِ سوزاں و سیل اشک رواں
ببیں کہ باز تنورست و جوش طوفانست

اگر جہاں شدہ بعد از زوال تیرہ و تار
زداغ ماتم شبیر صد چراغانست

فغاں کہ قصر و سر یر است بہرِ آل زیاد
حسین و قافلہ بے گور در بیابانست

بنائے بیت عزا یش حسن علی خاں کرد
ہمانکہ مال و زرش نذر دین و ایمانست

نوشت ناصری از خون قلب مصرعِ سال
بنائے بیت عزا از حسن علی خانست

۱۹۰۰ء

دیگر

تعالی اللہ چنیں تعمیر اینجا
جناں راشد عیاں تصویر اینجا
ہماں نواب دیں پرور کہ باشد
ملاذِ ہر جوان و پیر اینجا
ہماں نواب دانشور حسن جان
کہ ہست از خوبیِ تقدیر اینجا
بنائے بے مثالے کرد قائم
بیادِ شبّر و شبیر اینجا
رقم زد ناصری سالِ بنایش
"حسن منزل" شدہ تعمیر اینجا
سنہ ۱۹۰۰ء

قطعہ تاریخ وفات سیّد سبط حسن مرحوم

خلف سیّد ابن حسن مرحوم

زینہار از بادہ عشرت نسازی انجمن
ایکہ دانی عاقبت جامِ فنا باید زدن

دورِ گردوں می زند ہر لحظہ کوس الرحیل
اندریں غربت سرا تا چند می سازی وطن

تشنۂ جامِ سروری در جہاں یاللعجب
در دلت صد چشمۂ خونِ تمنّا موجزن

شمع را دیدی کہ با ایں گرمیِ ہنگامہا
ناگزیر افتاد آخر ساختن با سوختن

چشمِ عبرت برکشا و پردۂ غفلت بسوز
حالیا بنگر بحالِ نوحہ خوان خستہ تن

ذی حشم قدسی خصال و عابدِ شب زندہ دار
آں رئیسِ قصبۂ بھٹور میر ابنِ حسن

گریہٴ دارد کہ گریاں است از و خلقِ خدا
نوحہ خواند کز و لرزہ دلِ ہر مرد و زن

کاے سرورِ سینہ از خوابِ اجل بیدار شو
گوش کن یکدم صدائے نالۂ اہلِ وطن

حلۂ دامادیت زیبندہ بود اے نامراد
ہر کجا آں قدِ بالایت کجا رخستِ کفن
ایں نشانِ خانۂ ویرانیست کا نرا ساختم
کے بنائے یادگارت کرد اے سبطِ حسن
آہ روزِ بست و سوم بود از ماہِ صفر
تیرہ شد گیتی بچشم و رفت نورِ چشمِ من
یاحسین ایں نوجواں فرزند کز من شد جدا
با علی اکبر بجنت باد جائش مفتزن
بعد ختمِ قصۂ پُر درد کلکِ ناصری
نقش زد تاریخ از تعمیر آں بیت الحزن

شد بنائے منزلے در روضۂ مولا علی
سنہ ۱۹۰۶ء

یادگارے باشد از فرزند میر ابنِ حسن
سنہ ۱۳۲۴ھ

تاریخ وفات جناب مولوی سیّد کرامت حسین جج

وشاعر خوش بیان جناب اوج لکھنوی علی اللہ مقامہم

بند اوّل

اہل کمال اُٹھ گئے دل بیقرار ہے
لیکن یہی مشیّتِ پروردگار ہے

ماہر کوئی فصاحتِ اہلِ حجاز کا
اُردو کی شاعری کا کوئی افتخار ہے

اولاد اہل بیت سے ہے کوئی جاں بلب
مدّاح اہل بیت کوئی جاں نثار ہے

بیماریاں کہیں ہیں کہیں مرگ ناگہاں
سچ ہے کسی کی زیست کا کیا اعتبار ہے

موت آتے ہی نگاہ محبّت بھی پھر گئی
یہ بھی عجیب گردشِ لیل ونہار ہے

شیریں کلام لوگ جہاں سے گذر گئے
باقی فقط نوشتۂ لوحِ مزار ہے

کل تک بہار قلب وجگر جنکی ذات تھی
ہر شخص آج ان کے لئے سوگوار ہے

آنکھیں ہیں اشکبار تو دل ہیں بھرے ہوئے
ان بارشوں سے زخم جگر کے ہرے ہوئے

بند دوم

چھوٹا ہے وہ شفیق کہ پایا نہ جائیگا
یہ درد دل سے بار خدایا نہ جائیگا
پیوند خاک صورتِ نقشِ قدم ہے دل
یعنی گرا ہے یوں کہ اُٹھایا نہ جائیگا
وہ درد ہے جگر میں کہ اُڑتا ہے رنگ رخ
ایسا یہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائیگا
فریاد ہے کہ ہائے کرامت حسین ہائے
پہنچے وہاں جہاں سے پھر آیا نہ جائیگا
قانون و منطق و ادب و فقہ و فلسفہ
ان سب کو زیر خاک سُلایا نہ جائیگا
دور فلک نے صفحۂ عالم اُلٹ دیا
ہم جانتے تھے سر سے یہ سایا نہ جائیگا
طغرا قدم میں بن گیا نقشِ وفا ترا
دنیا مٹے مگر یہ مٹایا نہ جائیگا
کس طرح مرنے والے کی کوئی صفت کرے
بس خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

بندِ سوم

اے مرنے والے نزع میں کیوں مسکرا دیا
یہ کیا کیا کہ سارے جہاں کو رُلا دیا

نالے کی اب ہوس ہے نہ حسرت ہے آہ کی
کیسی ہوا چلی کہ مرا دل بجھا دیا

بوئے وفا مہکتی تھی جس کے جوار میں
اس گل نے آج شہرِ خموشاں بسا دیا

جو زندگی میں رُکن تھا دار العلوم کا
کیونکر کہوں کہ اس نے سبھوں کو بھلا دیا

اک رنگ فلسفہ کا تو دیکھا چڑھا ہوا
ایماں کا پایہ ورنہ بہت کچھ بڑھا دیا

شدّت میں نزع کی حرکت دل کی رُک گئی
یعنی سکونِ قلب کا نقشہ دکھا دیا

تربت پہ کوئی پھول چڑھانے جو آگیا
وہ دردِ دل میں تھا کہ یہ مطلع سنا دیا

آہستہ برگِ گُل بہ فشاں بر مزارِ ما
بس نازک است شیشۂ دل در کنارِ ما

بند چہارم (آخر)

اے چرخ اب ہو تذکرۂ مرگ اوج وائے
مرجائے وہ جو نام کو اسلاف کے جلائے
علم و عروض و مرثیہ و رنگ فلسفہ
کیا کیا مٹا جہان سے کیا کیا نہ یاد آئے
کہنے کی تاب ہے نہ تو سننے کی تاب ہے
پھر داستاں یہ کون کہے اور کسے سنائے
وہ خوش بیان وضع کا پابند وہ کریم
افسوس ہے کہ زیر لحد جاکے منہ چھپائے
یارب ندیم سیدِ شبان خلد ہو
جب وہ جوان ہو کے بہشتِ بریں میں جائے
حرف غلط نہیں ہیں یہ مونیں کہ محو ہوں
قلب و جگر کے داغ کوئی کس طرح مٹائے
سال وفات دونوں کا ہجری میں ناصری
لکھ مرگ اوج مرگ کرامت حسین ہائے
۱۳۳۵ھ

در سال عیسوی است دل زار نالہ زن
رفت اوج من چو مُردکرامت حسین من
۱۹۱۷ء

تاریخ وفات کیٹس شاعر خوش بیان

سرزمین انگلستان

کیٹس! اے تصویر خارستانِ دلہائے خراب
دل نواز و دل فگار و دل فروش و دل کباب

بافتی دل را بہ عشق و یافتی راہ صواب
آہ آں مرگِ جوانی۔ آں دلِ حسرت مآب

می سزد گر حسن بر رویش کشد نیلی نقاب

اے کہ در گیتی ز عمرِ خویش بیزار آمدی
ہمچو نرگس در ریاضِ دہر بیمار آمدی

باسرِ شوریدہ دور از وہم و پندار آمدی
جلوۂ حسنِ حقیقت را پرستار آمدی

در شبِ تارِ جہاں روشن نمودی آفتاب

نعرہ کردی کاے نظر بازان عالم ہوشیار
حسن را حق دان و حق را حسن ہر شے بر شمار

بس ہمیں دانستہ اید اندر جہانِ بے مدار
بس ہمیں دانستنی باشد دگر بے اعتبار

بس ہمیں گفتی و سوئے حق روان گشتی شتاب

اے کہ ماندی در فضائے دہر بست و پنج سال

آتشے در سینہ ات پنہاں نمودی لا

در بلادِ روم رفتی تا شود فرخندہ حال

جاں بحق دادی و عالم را برافزا

نوحۂ شامِ غریباں ۔ ماتمِ مرگِ شباب

رفتی و صد سال گرداں ماند چرخِ چنبری

تا کند پیدا نظیرِ تو بہ ملک ش

بر نیامد ہیچ دنیا را ہماں نوحہ گری

جست از سنگِ مزارت سال رحلت

گفت "خوابد آنکہ نامش بود چوں نقشِ برآب"

سنہ ۱۸۲۱ء

تمام شد

دیوان دوم

ستمبر ۱۹۱۹ء

نازتھا یا صبر تھا یا تو قریب دل نہ تھا
کیوں نہ دیکھا دیکھنا تیرا اگر مشکل نہ تھا

سیرِ دریا کرنے والے ہم بھی یاد آئے کہیں
کوئی ٹکرایا سفینہ کیا لبِ ساحل نہ تھا

دیکھ ظالم باعثِ نیرنگیِ عالم ہوا
وہ ہمارا دل جو تیری بزم کے قابل نہ تھا

دل ہمارا ہو کہ سنگِ طور سب کا قول ہے
حسنِ عالم سوز اپنے کام سے غافل نہ تھا

نیند سب کی کیوں اُڑائی شب کو کیوں تڑپا کیا
مرنے والے تیرا مرجانا تو کچھ مشکل نہ تھا

ایک قطرہ خون کا جو آنسوؤں میں بہ گیا
ہاں یہ دریا تھا وہی جس کا کہیں ساحل نہ تھا

کچھ سمجھ کیا تھا کہ برسوں ہجر میں تڑپا کیا
نام تیرا لے کے مر جانا تو کچھ مشکل نہ تھا

سجدۂ دیر و حرم دونوں میں رسوائی ہوئی
جستجو بیکار تھی پہلو میں جب تک دل نہ تھا

یاد آتا ہے دلِ مرحوم اکثر ناصری
زندگی کا جس کی دنیا میں کوئی حاصل نہ تھا

۱۰ر فروری ۱۹۲۰ء

عذر ستم سنا کے خطاب و عتاب کیا
جو بات لاجواب ہے اُس کا جواب کیا

پیری میں جو رُلائے وہ لطفِ شباب کیا
تعبیر جس کی خوب نہ ہو پھر وہ خواب کیا

باقی رہے جو ہوش تو جوشِ شباب کیا
دل میں بہار ہو تو سبو کیا شراب کیا

گیسو سنور چکے ہیں تو یہ پیچ و تاب کیوں
تڑپا ہے پھر مرا دلِ خانہ خراب کیا

عالم ہوائے عشق نے برباد کر دیا
میں کیا ہوں اور مرا دلِ خانہ خراب کیا

مُنہ تک کلیجہ آ کے پھرا یہ عجیب تھا
ورنہ جہاں میں ہوتے نہیں انقلاب کیا

دل کی تڑپ کو دیکھ کے سکتے میں ہے جہاں
کس سے کہیں سکوں ہے کیا اضطراب کیا

مے نوش لڑکھڑاتے ہیں ٹکرا رہے ہیں جام
لیتا ہے امتحاں کوئی مستِ شباب کیا

کیوں چاک کر کے سینے کے باہر ہوا ہے دل
آتا ہے کوئی بزم میں پھر بے نقاب کیا
ہو جوش حسن و عشق تو سمجھائیں کس طرح
طوفان کیا ہے اور یہ چشمِ پُر آب کیا
حیراں ہے آئینہ جو وہ کہتے ہیں بار بار
دیکھیں ہمارے حسن میں ہے آب و تاب کیا
کچھ بھی گداز دل نے بڑھایا نہ رنگ عشق
اس بحر غم میں قطرۂ خوں کا حساب کیا
ہم دل کے بس میں تھے تو وہ دیوانہ ہو گیا
اے ساتر العیوب ہمارا حساب کیا
اک کیفیت ہے خون کا رگ رگ میں دوڑنا
سنبھلے بہار میں کوئی مستِ شباب کیا
ہو خاکسار بن کے سرافراز ناصرؔی
ورنہ یہ فخر بندگیِ بو تراب کیا

۲۲۔ جنوری سنہ ۱۹۲۱ء

مرے دل آج اپنی زیست سے بیزار ہو جانا
مسیحائی کو آتا ہے کوئی ہشیار ہو جانا

مجھے دل کا یکایک مرگ پر تیار ہو جانا
غضب ہے فتنۂ خوابیدہ کا بیدار ہو جانا

دلِ مرحوم کا ماتم ہی کیا۔ تابوت اُٹھنا کیا
تڑپ جانا جگر کا آنکھ کا خونبار ہو جانا

تری خاطر ترے کوچے میں دل ہے خوار یا قسمت!
ہر اک کی ٹھوکریں کھانا مگر ناچار ہو جانا

شعاعِ مہر میں ذرّوں کی گردش دیکھنے والے
نہیں آسان تابِ جلوۂ دیدار ہو جانا

گرا تیورا کے پھر سر تھام کے دوڑا یہ کیا مجنوں
بگولے کا بھی ممکن ہے کہیں دیوار ہو جانا

ہر اک گُل پر بہار آتے ہی مجھکو پیار آتا ہے
اُدھر کھلنا اِدھر میرے گلے کا ہار ہو جانا

تلاطم بحرِ الفت کا یہی بڑھ بڑھ کے کہتا ہے
تباہی کو یہاں کہتے ہیں بیڑا پار ہو جانا

قبولِ دعوتِ شعر و سخن اے ناصری کب تک
نہیں مہماں کو لازم میزباں پر بار ہو جانا

سنہ ۱۹۲۲ء

عبرت ہے شبِ غم میں تاروں پہ نظر کرنا
جل جل کے فنا ہونا مر مر کے سحر کرنا

ٹوٹے نہ کوئی دل کو غربت کا زمانہ ہے
کہدو کہ مسافر کو ہے دور سفر کرنا

دنیا کو حسینوں کا دیدار مبارک ہو
ہم کو تو جہاں دل ہو اُس سمت نظر کرنا

دل کو تو مرے دیکھا لے محو خود آرائی
آئینے کے جانب بھی ہاں ایک نظر کرنا

ہے منزلِ الفت کا رہبر دلِ آوارہ
جس راہ یہ لے جائے اُس راہ سفر کرنا

جلوہ ہے مہِ نو کا خلقت ہے تماشائی
اِس وقت ذرا خنجر پھر زیب کمر کرنا

پھر ناصری آ پہونچا کعبہ کی پرستش کو
للہ ذرا جا کر اُس بت سے خبر کرنا

۲۹ جولائی ۱۹۲۲ء

ہر اک کو حالِ دل رو کر سنایا
نہ پہچانا ذرا اپنا پرایا

یہ فصلِ گل یہ بجلی کا کڑکنا
بچانا آشیاں میرا خدایا

خود اپنا ہی نشاں ملتا نہیں اب
خدا جانے کہاں دل مجھکو لایا

حرم میں بھی ہے شغل بت پرستی
پڑا آخر یہ کس کافر کا سایا

ذرا سُن اے جلانے والے دل کے
چراغ آکر لحد پر کیوں جلایا

کوئی پوچھے تو وقتِ دفن اُن سے
کہ ہم کو خاک میں کس نے ملایا

یہ کیا تھا ناصری کیوں فصل گل میں
الہ آباد سے بجنور آیا

۳۰- اکتوبر ۱۹۳۲ء

بجنور ہیں نہ پوچھو لقب دل کا کیا ہوا
غربت کا مارا دوست کے در سے چھٹا ہوا

برسات ختم ہو گئی- بادل برس گئے
رو جائے جس طرح سے کوئی دل بھرا ہوا

سردی بڑھی ہوائے پریشاں کا دَور ہے
پھرتا ہو قافلہ کوئی جیسے لُٹا ہوا

وہ دل جو ساری رات چراغِ سخن رہا
اب دیکھتے ہیں شام سے اس کو بجھا ہوا

تاریکیِ لحد رہی نظروں میں رات بھر
کیا جانے میری شام غریباں کو کیا ہوا

وہ دل نہیں وہ ہم نہیں وہ ولولے نہیں
اک نقش رہ گیا ہے تو وہ بھی مٹا ہوا

اب ہم ہیں اور چراغ شب غم ہے ناصری
پروانہ شمع پاس ہو جیسے جلا ہوا

۸۔ نومبر ۱۹۲۴ء

فنا کا راز جو کونین پر عیاں ہوتا
ترے شہید کا ماتم کہاں کہاں ہوتا

بہار ہوتی جو صیاد راز داں ہوتا
نہ میں اسیر نہ برباد آشیاں ہوتا

مجھے جو رخصت عرض نیاز ہو جاتی
حریم ناز میں تیری عجب سماں ہوتا

ہماری منزلِ مقصود نامرادی ہے
خدا نخواستہ کیوں کوئی مہرباں ہوتا

جو ساتھ ہوتے کچھ آوارگانِ دشت جنوں
دلِ غریب خدا جانے تو کہاں ہوتا

دل و دماغ جو قابو میں ناصری ہوتے
تو میں نہ خاطرِ احباب پر گراں ہوتا

۱۷- نومبر ۱۹۲۴ء

اے چارہ گر مَیں جینے کے قابل نہیں رہا
سینے سے آ رہی ہے صدا دل نہیں رہا
طوفانِ غم کا زور ہے۔ اللہ کی پناہ۔
پیشِ نگاہ دامنِ ساحل نہیں رہا
انجام کچھ نہیں سہی اک مشغلہ تو ہے
مَیں شکوہ سنجِ دوریِ منزل نہیں رہا
دیوانگانِ دید کو دی برق نے نوید
جز سنگ طور اب کوئی حائل نہیں رہا
کامل جو بیخودی ہو تو عینِ شہود ہے
غافل جو ہو گیا ہے وہ غافل نہیں رہا
طوفاں فقط تھا میری تباہی کے واسطے
دریا نہیں رہا ہے کہ ساحل نہیں رہا
وہ دن گئے کہ رہتی تھی مجھکو تری تلاش
اب اپنی جستجو کے بھی قابل نہیں رہا
ہوں ہم نوائے غالبؔ دلگیر ناصریؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

۱۸- نومبر ۱۹۲۴ء

ذرّے ذرّے کو ہوا شوق خود آرائی کا
سارا عالم ہے مرقع تری یکتائی کا

دل سنبھلتا ہی نہیں آنکھ ٹھہرتی ہی نہیں
کس طرح کھینچ لوں نقشہ تری رعنائی کا

سن کے افسانۂ طور آپ کے در تک آیا
دیکھئے دیکھئے کیا دل ہے تماشائی کا

آتشِ طور کجا۔ وعدۂ دیدار کجا
اک بہانہ تھا فقط حوصلہ فرسائی کا

بند آنکھیں ہوئی جاتی ہیں تماشائی کی
قابل دید ہے عالم تری رعنائی کا

دل کو رخصت کیا اور جان کو قربان کیا
دیکھنے جاتا ہوں عالم شبِ تنہائی کا

الحذر وہ دلِ سوزاں کا فنا ہو جانا
اور بجھنا وہ چراغِ شبِ تنہائی کا

مر کے آنکھیں ہوئیں روشن ترے جلوے دیکھے
زندگی نام تھا شاید شبِ تنہائی کا

کون سی بات میں کم ہے مرا ویرانۂ دل
کیوں کروں حوصلہ پھر بادیہ پیمائی کا
روح پھر کھینچ کے مری جان لبوں تک آئی
یاد پھر آگیا عالم تری انگڑائی کا
تم خفا ہو کے مری خاک نہ برباد کرو
اور پھیلے گا فسانہ مری رسوائی کا
جا بجا دیکھ لیں زنداں میں لہو کی چھینٹیں
پڑھ لیا سارا فسانہ ترے سودائی کا
ناصرؔی دیکھ کے ہنگامۂ روزِ محشر
یاد آتا ہے زمانہ مجھے رسوائی کا

۲۳- نومبر ۱۹۲۴ء

سرِ شوریدہ میں سودا ہوا سیرِ گلستاں کا
بہار آئی خدا حافظ در و دیوارِ زنداں کا

ہزاروں آرزوئیں دفن کر دیں تیرے کوچے میں
رہا دل- وہ چراغِ کشتہ ہے گورِ غریباں کا

ہوائے شوق میں پیہم وہ بیتابی وہ بربادی
مرے دل کا مرقع ہے ہر اک ذرہ بیاباں کا

خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید
لبِ گور آکے نقشہ دیکھ لو شہرِ خموشاں کا

کیا ہے ظاہر و باطن کو یکساں میری وحشت نے
جو عالم ہے مرے دل کا وہ عالم ہے بیاباں کا

ستارے ڈوبتے ہیں جس طرح پچھلے کو گردوں پر
یہی انجام ہوتا ہے شبِ غم قلبِ سوزاں کا

چراغِ طور کے مالک! بچا غم سے مرے دل کو
سہارا کون طوفاں میں چراغِ زیرِ داماں کا

یدِ قدرت کی مہریں جا بجا پھولوں پہ ہیں بلبل
ترا گلزار محضر بن گیا خونِ شہیداں کا

خزاں میں گر کے ہر برگِ شجر آواز دیتا ہے
کرے گا یوں ہیں اک دن ورق اس بزمِ امکاں کا

۱۷- جنوری ۱۹۲۶ء

اِس سے کیا مطلب کہ میں دیوانہ یا بدنام تھا
بات رکھ لینا بھری محفل میں میرا کام تھا
موت کے پردے میں پنہاں زیست کا انجام تھا
کچھ اندھیرا بیچ میں آگے خدا کا نام تھا
تھی شبِ فرقت کی آمد خوف کا ہنگام تھا
اک طرف دل اک طرف لرزاں چراغِ شام تھا
خانقاہ و دیر دونوں میں پریشاں ہو گیا
میں جہاں پہونچا وہاں اک شور بے ہنگام تھا
کون لایا مجھکو یارب جلوہ گاہِ ناز تک
ساتھ تو قسمت تھی میری یا دلِ ناکام تھا
ایک جھونکے نے ہوا کے جس کو ٹھنڈا کر دیا
میرے طالع کا ستارہ وہ چراغِ شام تھا
دل کے ٹکڑوں سے کیا زنداں کو کیوں آئینہ بند
کس کی صورت دیکھنے کا شوق اے ناکام تھا

دل رُبا تھا رات کو گورِ غریباں کا سماں
چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور خدا کا نام تھا

شام ہی سے آشیاں پر بجلیاں گرنے لگیں
فصلِ گل کا ہر کرشمہ دشمنِ آرام تھا

دیکھ تو لیتا کہ اشک آنکھوں سے کیوں جاری ہوئے
فتنہ گر لبریز میری زندگی کا جام تھا

شامِ زنداں کی وہ ہیبت وہ ترے وحشی کی موت
نالہ زن تھیں سیکڑوں روحیں بڑا کہرام تھا

ناصرؔی دیر و حرم دونوں ہی دلکش تھے مگر
آستانِ دوست پر مرنا ہمارا کام تھا

۳۱- جنوری ۱۹۲۶ء

طور پر پھر بجلیاں گرنے کا ساماں ہوگیا
آج پھر میرا دلِ سوزاں پریشاں ہوگیا

کچھ عجب قصہ ہوا اے جاں دلِ مرحوم کا
آپ کی نظروں سے گرنا تھا کہ بے جاں ہوگیا

خوش تھے یا ناخوش نگاہیں تھیں مجھی پر حشر میں
خیر جو کچھ ہو علاجِ درد پنہاں ہوگیا

روشنی دل میں کہاں سے آگئی مرنے کے بعد
بجھتے بجھتے یہ کنول کیونکر فروزاں ہوگیا

رشک صد گلشن بیاباں تھا جنوں کے دَور میں
اب وہ دَور آیا کہ ہر گلشن بیاباں ہوگیا

مشتعل ہونے پہ تھی تیّار دنیا عشق سے
جس طرف تم نے نظر ڈالی چراغاں ہوگیا

خون کا قطرہ تھا جب قابو میں دل تھا ناصری
اور قابو سے نکلنا تھا کہ طوفاں ہوگیا

۲۶-جون ۱۹۲۶ء

نویدِ زندگی کے ساتھ پیغامِ اجل پایا
کہ تم نے دلربائی میں نے دل روزِ ازل پایا

دلِ بیمار راہِ شوق میں مرمر کے چل پایا
یہ جس منزل پہ ٹھہرا جا کے پیغامِ اجل پایا

خلش جینے کی راہِ شوق میں چلنے نہ دیتی تھی
بہا جب خون ہو کر دل تو یہ کانٹا نکل پایا

تڑپ کے آہ کی اور جان دیدی کنجِ فرقت میں
مبارک ہو ترا بیمار اک کروٹ بدل پایا

مری خاکسترِ دل تم نے کی برباد یا قسمت
مگر پتھر نے سرمہ بن کے آنکھوں میں محل پایا

دکھا دوں گا میں نقشہ انقلابِ دہر کا سب کو
دلِ بیمار نے میرے اگر پہلو بدل پایا

خدا کی شان تھی یا تھی شہید ناز کی میت
بتا کیا کنج تنہائی میں اے پیک اجل پایا

وہ ہو قندیل عرشِ پاک یا شعلہ مرے دل کا
کرشمہ ایک جلوے کا ابد سے تا ازل پایا

وہی تھی حسن کی سطوت جو صبح حشر ہوش آیا
بلند آوازۂ حی علیٰ خیر العمل پایا

وہ عبرت وہ امید و یاس کی ہنگامہ آرائی
نہ میرا دل سنبھل پایا نہ میرا دل نکل پایا

وہ میری شام غربت ناصریؔ وہ سیر منصوری
کہیں روشن ستارہ اور کہیں روشن کنول پایا

نوٹ :- یہ غزل منصوری کے مشاعرہ میں پڑھی تھی۔

۶ - نومبر ۱۹۲۶ء

ہجر میں کوئی نہ تھا اپنا - الم کا جوش تھا
ایک دل تھا وہ کبھی بیخود کبھی خاموش تھا

آج جامِ زہر بھی اپنے مقدّر میں نہیں
محفلِ مے تھی کبھی اور شورِ نوشا نوش تھا

ہائے کیسا جانستاں تھا ہجرِ جاناں کا سماں
چارہ گر بھی چپ تھے اور بیمار بھی خاموش تھا

دل مرا تڑپا تو کیوں لرزے زمین و آسماں
ایک قطرہ خون کا تھا اور اُس میں جوش تھا

میری بالیں پر شبِ غم جمع تھے کیوں نوحہ گر
نیند آئی تھی چراغِ زندگی خاموش تھا

میکدے کی بات رکھ لی ایک مستِ ناز نے
بس جسے دیکھا نظر بھر کے وہی بیہوش تھا

کیا سنی گورِ غریباں سے صدا فریاد کی

میں پکارا تم کو سارا شہر جب خاموش تھا

مختصر یہ داستاں ہے جلوہ گاہِ ناز کی

مٹ گئے تھے اہل دل بے دل جو تھا بیہوش تھا

حسن کا وہ رعب وہ سطوت نگاہِ ناز کی

دل کی بستی لُٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا

کنج فرقت سے لحد تک کیا سماں تھا ناصرؔی

میں جہاں پہونچا وہاں سارا جہاں خاموش تھا

۷- نومبر ۱۹۲۷ء

آہ نے تاثیر کی سینے میں روزن ہو گیا
میرے طالع کا ستارہ آج روشن ہو گیا

چھپ کے نظروں سے کوئی یوں جلوہ افگن ہو گیا
غش ہوئے موسیٰ چراغ طور روشن ہو گیا

دل نے لٹوایا مجھے اور دل کے مالک آپ تھے
کیا بتاؤں کون رہبر کون رہزن ہو گیا

مار ڈالا ایک ظالم کی نگاہِ ناز نے
خواب دیکھا تھا کہ جیسے دل میں روزن ہو گیا

دامنِ گل کی ہوا دینا جو غش کھا کے گروں
پھر میں سمجھوں گا قفس رشکِ نشیمن ہو گیا

چاہتا ہے شان سے یوسف کی ہو دیوانہ قید
لو گریباں کی طرح سے چاک دامن ہو گیا

رات جب کی آہ میں نے برق چمکی باغ پر
اب میں سنتا ہوں کہ خاکستر نشیمن ہو گیا
مختصر یہ حال ہے دیوانگانِ عشق کا
پردہ پوشِ بیکسی۔ صحرا کا دامن ہو گیا
نزع کا ہنگام ہے اب کیا دکھاؤں دل کے داغ
پھول سب کمھلا گئے۔ تاراج گلشن ہو گیا
الحذر اے مانگنے والے مرادِ عشق کے
یہ نہ سمجھا تُو کہ اپنا آپ دشمن ہو گیا
کشتگانِ غم کی فریادیں ہیں اور ہم ناصری
کنج تنہائی سے بدتر کنج مدفن ہو گیا

دیگر

در پہ نگاہِ یاس تھی لب پہ تھا نام یار کا
بس یوں ہی خاتمہ ہوا کشتۂ انتظار کا

باغ کو پا کے آئینہ حسن و جمالِ یار کا
مجھکو جنون ہو گیا نام ہوا بہار کا

شور فغاں بلند ہے ہوش و حواس منتشر
حشر نمونہ بن گیا آپ کے جلوہ زار کا

دامنِ وحشت نے نہاں سب کی نظر سے کر دیا
آپ مٹائیں کیوں نشاں آ کے مرے مزار کا

ہجر ہے اور ہراس ہے دل پہ ہجوم یاس ہے
شام سے گھر اُداس ہے عاشقِ غمگسار کا

باغ کے نالے اور ہیں قید کی داستاں ہے اور
کنج قفس میں ہمصفیر لطف کہاں بہار کا

تیری نگاہ ناز سے کتنے شہید ہو گئے
سارے جہاں کو ہے گلہ گردشِ روزگار کا

دیگر

یاد ہے عالم دلِ بیتاب کی تاثیر کا
وہ مرے نالے وہ ہلنا عرش کی زنجیر کا
ٹوٹ جانے پر بھی جذبِ دل کا اک اعجاز ہے
اس طرح سالم اُتر آنا تری تصویر کا

دیگر

اشک خوں آنکھوں سے نکلے دل میں جوشِ غم ہوا
خیر ہو یارب یہ کس ارمان کا ماتم ہوا
میری تربت کو مٹایا آپ نے اچھا کیا
آج عبرت کے صحیفے کا ورق اک کم ہوا
موت کا آیا پسینہ رازِ ہستی کھُل گئے
عمر کا پیمانہ یوں چھلکا کہ جامِ جم ہوا

قفس میں پکاروں جو میں ہمصفیرو
تو آواز پر میری آواز دینا

فرد

دیکھا تھا جدھر تو نے اُس سمت مرا دل تھا
آئینے سے آئینہ محفل میں مقابل تھا

فرد

حسرت پہ جس شہید کی دنیا کو ناز تھا
اللہ جانتا ہے بڑا بے نیاز تھا

دیگر

ماہِ نو نکلا کہ خنجر کھنچ گیا جلاد کا
عید آئی غُل ہے مقتل میں مبارکباد کا
ہائے یہ کالی گھٹائیں اور یہ کنج قفس
اب تو دم گھٹنے لگا ہے بلبلِ ناشاد کا
شام غربت میں مزا شامِ اودھ کا ناصری
لکھنؤ سے مل گیا نقشہ الہ آباد کا

۲۳-جنوری ۱۹۱۷ء

سامنا حسن کا کیا کیجئے تنہا ہو کر
دل بھی اُن کی ہی سی کہنے لگا اپنا ہو کر

آؤ نیرنگیِ دنیائے محبت دیکھو
جان لیتا ہے کوئی آج مسیحا ہو کر

بیکسی گورِ غریباں کی فقط باقی ہے
امتحانِ دلِ عاشق کا نتیجا ہو کر

ہاں! یہی بوند لہو کی جسے دل کہتے ہیں
ایک دن آنکھوں سے بہ جائیگی دریا ہو کر

ساقیا دیکھ لے شیشے میں ٹھہرتی نہیں مے
کوئی تو آیا ہے میخانے میں پیاسا ہو کر

رشتۂ عشق تو دیکھو کہ دلِ قیس کا حال
نظر آیا شکن طرۂ لیلا ہو کر

رنج ہے کیوں ہوئے پامال مرے قلب و جگر
کاش رہ جاتے ترے نقش کفِ پا ہو کر

واہ کیا خوب مٹایا مری تربت کا نشاں
ذرہ ذرہ نظر آنے لگا صحرا ہو کر

ناصری سرخیِ رخسار ہو یا شوخیِ گل

۳۱- جنوری ۱۹۲۰ء

(۱)

حشر میں شکوے کرو لیکن مرا دل دیکھ کر
کوئی برہم ہو چلا ہے رنگ محفل دیکھ کر

دل کے ارماں چل بسے بربادیِ دل دیکھ کر
اُٹھ گئی محفل کی محفل رنگ محفل دیکھ کر

آج تک حسرت برستی ہے ہماری قبر پر
جو کوئی آتا ہے روتا ہے یہ منزل دیکھ کر

یوں نہ سمجھے گا تو افسانہ دلِ مجروح کا
سُن ہماری داستاں تصویرِ قاتل دیکھ کر

وہ تلاطم بحر کا وہ کشتیوں کا ڈوبنا
آنکھ میں آنسو بھر آئے سیرِ ساحل دیکھ کر

نزع میں تڑپا تو ظاہر ہو گئے اسرارِ عشق
مشکلیں کتنی ہوئیں حل میری مشکل دیکھ کر

آپ کا دل جانتا ہے حسن کیا ہے عشق کیا
کیوں نظر آئینے پر ڈالی مرا دل دیکھ کر

اے خدا خونِ شہید اس رنگ لائیگا ضرور
مجھسے محضر مانگنا دامانِ قاتل دیکھ کر

کیوں چمک ہے زخم دل میں کیوں ہوا یہ لاعلاج
چاند کو دیکھا کیا میں روئے قاتل دیکھ کر

ناصرؔی پھر شاعری کا چھوٹنا آسان ہے
رحم اگر ضامن کریں میرے مشاغل دیکھ کر

۲۹۔ جولائی سنہ ۱۹۲۲ء

مسافر ہو تو ترکِ عیش ہے اے ہم نفس بہتر
صدائے ساز مطرب سے ہے آوازِ جرس بہتر

الہ آباد سے بجنور میں آئے تو غم کیا ہے
گل و گلزار سے اس آشیاں کے خار و خس بہتر

غرض کچھ اشکِ شبنم سے نہ مطلب خندۂ گل سے
اگر ہو شوق تنہائی تو گلشن سے قفس بہتر

وبال دوش سر تھا۔ مل گئے کہسار کے دامن
گذشتہ سال سے گزرے گی کچھ اب کی برس بہتر

نہ کر نالے کہ دردِ ہجر درمان محبت ہے
اگر ہے پاس رسم عشق تو ضبطِ نفس بہتر

کروں گا میں بھی داغِ ہجر سے نام وفا روشن
مری دوری ہی سے گر آپ راضی ہیں تو بس بہتر

وطن سے چھوٹ کے لذت نہ پائی ناصرِی کوئی
یہاں کی سلطنت سے اس گدائی کی ہوس بہتر

۲۸۔ نومبر ۱۹۲۶ء

کرم ہے فصل گل کا وحشیوں کی آہ سوزاں پر
وہ بادل آئے۔ وہ بجلی گری دیوارِ زنداں پر

اجازت کس سے مانگے دفن کی حیران ہے خلقت
ہے تابوت ایک بیکس کا زمینِ کوئے جاناں پر

خدا کا نام لے کے جھیل جاتا عشق کے صدمے
ارے کافر! چھری کیوں پھیر دی میری رگِ جاں پر

شہیدِ ناز کو دشتِ بلا میں چین آئے گا
نشانِ قبر بنوا دو زمینِ کوئے جاناں پر

لحد میں سونپ کے بھی وہ مجھے سمجھے اسیر اپنا
مری تصویر کھنچوائی گئی دیوارِ زنداں پر

شبِ مہتاب میں یہ کون ماتم دار آئے ہیں
نظر آتی ہیں کچھ پرچھائیاں گورِ غریباں پر

نہ دیکھا اس کا جلوہ صبح تک گنتا رہا تارے
فلک! اتنا ستم فرقت میں! اور اک شب کے مہماں پر

کھلا ہے دشتِ غربت میں کسی کے قتل کا محضر
نظر آتے ہیں دھبے خون کے خاکِ شہیداں پر

وہ اک بیکس کا مرنا! وہ مرقع جانگدازی کا
وہ آنکھیں خونچکاں اور وہ نگاہیں شمعِ سوزاں پر

خزاں کی فصل تک اے ناصری ماتم کرو دل کا
بہار آئے تو ہوں گلکاریاں صحرا کے داماں پر

دیگر

جفا ہر ایک ہو گی جانستاں حسن ادا ہو کر
کسی کو آج دعویٰ ہے وفا کا بے وفا ہو کر
دلِ ناکام قصّہ ختم کر نذرِ جفا ہو کر
وفا کا امتحاں لیتا ہے کوئی بے وفا ہو کر
کبھی ترچھی نگاہیں ہیں کبھی نیچی نگاہیں ہیں
یہی وہ تیر ہیں کرتے ہیں جو گھائل خطا ہو کر
جسے چاہا اُسے مارا جسے چاہا اُسے بخشا
بتوں نے حشر برپا کر دیا آخر خدا ہو کر
مبارکباد مرگِ ناگہاں سب جاں نثاروں کو
کوئی بے درد مقتل سے چلا آیا خفا ہو کر
نویدِ وصل دے کر مار ڈالا جوشِ الفت نے
ڈبویا سامنے ساحل کے بیڑا ناخدا ہو کر
معاذ اللہ! کیا چلتا ہوا جادو ہے ساقی کا
گئے ہیں ناصری بھی میکدے میں پارسا ہو کر

۶- دسمبر ۱۹۱۹ء

بہار آتے ہی جوش ایسا ہوا خونِ شہیداں میں
کہ گُل ہی گُل نظر آنے لگے کوہ و بیاباں میں

نہ ہنس ناصح میرے دل پر شبِ تاریک ہجراں میں
یہی وہ شمع ہے برسوں جلی جو بزم امکاں میں

اُنھیں ہنس ہنس کے بس بجلی گرانا جب اِدھر آنا
وہ کیا جانیں لگی ہے آگ کس کے قلب سوزاں میں

رواں ہے سَیل اشک آنکھوں سے دل فریاد کرتا ہے
"مدد اے ناخدا کشتی مری آئی ہے طوفاں میں"

نگاہوں میں دلِ برباد کا پھرنے لگا نقشہ
نظر آئے اگر اُڑتے ہوئے ذرّے بیاباں میں

نہ پوچھو کس نے مارا بے خطا یارو! اِدھر آؤ
دکھائیں تم کو اک تصویر اپنی چشمِ حیراں میں

یہ کیا مُنہ سے کہا جو دی گئی منصور کو سُولی
یہ کس کا رازِ ہستی تھا نہاں اِس رازِ پنہاں میں
ہلا کرتی ہیں اک ٹوٹی ہوئی زنجیر کی کڑیاں
کسی کی روح شاید بار بار آتی ہے زنداں میں
دلِ صد پارہ اپنے سینۂ ویراں کا یاد آیا
نظر آئے اگر اُڑتے ہوئے ذرّے بیاباں میں
عجب معجز نما یہ بورڈنگ[۱] اے ناصری نکلا
دکھایا موسمِ گُل کا سماں فصلِ زمستاں میں

---

[۱] مسلمان بورڈنگ ہاوس الہ آباد
جس کے مشاعرہ میں یہ غزل پڑھی گئی تھی

۱۸- نومبر ۱۹۱۹ء

کس قہر کا طوفاں ہے بپا دیدۂ تر میں
قائم نہیں رہتی تری تصویر نظر میں

گرداب بلا سے جو رہائی مری چاہو
نکلے وہ دعا دل سے جو ڈوبی ہو اثر میں

مرنے پہ بھی میں تیری نگاہیں نہیں بھولا
اب تک تو کئی تیر کھٹکتے ہیں جگر میں

جیتا رہا میں مشقِ تصوّر کے سہارے
شب بھر تری تصویر رہی میری نظر میں

کیا اہل جنوں کے لئے جلنا ہے مقدّر
شعلہ نظر آتا ہے گریبان سحر میں

کیونکر وہ کرے گردشِ طالع کی شکایت
آتا نہیں دم بھر جسے ہوش آٹھ پہر میں

۲۶-جون ۱۹۳۲ء

مضطرب روح کوئی آ گئی میخانے میں
خود بخود مے کو ہے گردش مرے پیمانے میں

کبھی مسجد میں پکارا کبھی بتخانے میں
ہوش کی باتیں ہیں ساری ترے دیوانے میں

دل کی اُجڑی ہوئی بستی کو غنیمت سمجھو
جو خزانہ ہے نہاں ہے اسی ویرانے میں

موت کی نیند جب آئی مری قسمت جاگی
بال کھولے کوئی آتا ہے عزاخانے میں

نہ سہی عقل ترے دل پہ تصرف کیوں ہے
کوئی تو بات ہے آخر ترے دیوانے میں

سرحدِ عالم فانی کو بقا کہتے ہیں
دیر پھر کس لئے ہستی سے گذر جانے میں

محفلِ وعظ میں ہے مست ہر اک وہم پرست
ہم تو گھبرا کے چلے آئے ہیں میخانے میں

دل کے پردے میں جو فطرت کا مرقع دیکھا
لامکاں تک نظر آیا اسی کاشانے میں

ناصری وعظ سنی ہے تو بھٹکتے ہو بہت
آؤ دم بھر کے لئے چلتے ہو میخانے میں

۱۔ فروری ۱۹۲۵ء

بات پر اپنی بہر طور رہے جاتے ہیں
ہم شب و روز ترا نام لئے جاتے ہیں

کرب بڑھتا ہے بچا آکے مٹانے والے
جاتے جاتے تجھے آواز دیے جاتے ہیں

عکس رُخ نے ترے دکھلائی نرالی دنیا
ہنس کے جمشید پہ اب جام پیے جاتے ہیں

تیرے دامن کا سہارا ہے اب اے دشت جنوں
سب مجھے تیری حفاظت میں دیے جاتے ہیں

قبر پر میری چڑھا دیتے ہیں وحشی زنجیر
خیر اتنی مری تعظیم کئے جاتے ہیں

الحذر آپ نے رو کر مری تربت پہ کہا
رونے والے یوں ہی خاموش کئے جاتے ہیں

خواب دیکھا تھا کہ اک عرش کا تارا ٹوٹا
دفن دل کو ترے کوچے میں کئے جاتے ہیں

شکوہ سنجی کی رہی کوئی نہ صورت باقی
آج میرے دہن زخم سئے جاتے ہیں

ناصری ایک وہ ہیں جن کو تغافل پہ ہے ناز
ایک ہم ہیں کہ انھیں یاد کئے جاتے ہیں

۲۸- فروری ۱۹۲۵ء

اُسی بے نیاز کا عکس ہے مری شانِ عجز و نیاز میں
دلِ بیقرار میں آ گئی جو چمک تھی جلوۂ ناز میں

یہ لہو جو آنکھوں سے بہ گیا یہی دل تھا محفلِ ناز میں
یہی رابطہ یہی فاصلہ تھا حقیقت اور مجاز میں

تری بیخودی پہ ہوں میں فدا تو عجیب چیز ہے واعظا
مجھے وجد تیرے کلام پر تجھے شبہ مے کے جواز میں

جو نگاہ تجھسے لڑی ذرا میں حرم سے دیر میں آ گیا
یہ کہاں کا نشہ تھا ساقیا تری چشمِ فتنہ طراز میں

مرے دل کی واں تھی بساط کیا مری کائنات نشاط کیا
فقط ایک شعلہ بھڑک گیا تھا کسی کی محفلِ ناز میں

مجھے کوہ طور سے کام کیا۔ مجھے چین قبر میں مل گیا
کہ ہمیشہ چاہئے تخلیہ ہو مقام راز و نیاز میں

وہ بلا نصیب ہے دل مرا جسے ہجر و وصل سب ایک ہیں
نہ اندھیری رات میں نیند ہے نہ ہے چین زلفِ دراز میں

وہ دیار حسن کے آستاں وہ رواج و رسم کہ الاماں
وہی سر ہمیشہ قلم ہوئے جو جھکے سجودِ نیاز میں

فقط اک نگاہ سے ناصری سر بزم حسن نے رُلا دیا
اسی فتنہ ساز کا عکس ہے مرے دل کے سوز و گداز میں

۱۰۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء

مایوسیوں کی آہ کوئی انتہا نہیں
ہنس ہنس کے غیر کہتے ہیں اس کا خدا نہیں

میں نے جنوں میں سجدہ کسی کو کیا تو کیا
نظروں میں آپ ہی ہیں کوئی دوسرا نہیں

جلتی ہے ایک شمع سرہانے مریض کے
اب کس سے لَو لگی ہے کوئی پوچھتا نہیں

بالیں پہ مری شکوے کئے یوں ہزار ہا
جیسے کسی کو آپ سے کوئی گلا نہیں

مرنا ہی خوب ہے دلِ مایوس کے لئے
وہ کیا کرے کہ جس کا کوئی آسرا نہیں

مَوت و حیات ایک ہیں عاشق کے واسطے
وہ غم ہے دل میں جس کی کوئی انتہا نہیں

ٹھنڈے پڑے ہیں گورِ غریباں کے سب چراغ
اس ملک کی بھی اپنے موافق ہوا نہیں

۳-جون ۱۹۲۶ء

کیا آستانِ دیر پہ یارب نظر نہیں
اُس کی بھی سُن لے جس کی دعا میں اثر نہیں

تھرّا رہی ہے لَو مرے شمعِ حیات کی
وہ رات آگئی ہے کہ جس کی سحر نہیں

پتّھر کے بھی ہے دل وہ کسی شکل کا سہی
اے برق طور میری طرف آ- اُدھر نہیں

گوشے میں بھی نہ چین ملا تیری بزم میں
برچھی لگی ہے دل پہ یہ ترچھی نظر نہیں

بُلبل بغیر باغ ہیں سونے پڑے ہوئے
عالم بدل گیا ہے جو اک مُشت پر نہیں

اکثر نوید زیست ملی شکل مرگ میں
دیکھا تو راہِ عشق میں کوئی خطر نہیں

شعلے نکل رہے ہیں دلِ بیقرار سے
کیونکر لگی یہ آگ کسی کو خبر نہیں

آئینے میں یہ برہمیِ زلف دیکھئے
بیمارِ غم کا حال تو نوعِ دگر نہیں

قاتل ہے بے نیاز، میں بیکس شہید ہوں
دونوں جہاں میں کوئی مرا نوحہ گر نہیں

تیرے شباب کا ہے ستارا عروج پر
تجھ پر نظر کرے یہ کسی کا جگر نہیں

انگڑائی لے کے تو جو لگا دے لبوں سے جام
توبہ بھی ٹوٹ جائے تو کوئی خطر نہیں

منصوری اور سیرِ دلِ زارِ ناصری
میں کیا بتاؤں آج کدھر ہے کدھر نہیں

۲۷- نومبر ۱۹۲۶ء

جو تم نہیں ہو تو دل تک بھی غمگسار نہیں
کسی کا ہائے مصیبت میں اعتبار نہیں
خدا کا قہر ہے یا آپ کا تغافل ہے
بنی ہے جان پہ اور ہم کو اختیار نہیں
ہمارے پاس سے روتا ہوا چلا قاصد
سمجھ گیا ہے کہ اب تاب انتظار نہیں
ہوائے غم سے گلِ زخم رہتے ہیں شاداب
خزاں کا خوف نہیں منّتِ بہار نہیں
سنا ہے کوفت میں ہو جاتا ہے لہو پانی
یہ کیا ہوا ہے کہ آنکھیں اب اشکبار نہیں
پکارتا ہوں جنوں میں کسی کو ہر جانب
جواب کا بھی کسی سے امیدوار نہیں

جو سوگوار ہوں رو لیں وہ اپنی حالت پر
شہیدِ ناز و ادا کا کہیں مزار نہیں

پلا کے جامِ فنا مژدۂ بقا نہ سنا
کہ زیست کا کسی عالم میں اعتبار نہیں

گھٹائیں چھائی ہیں اُمڈے ہوئے ہیں دل ساقی
پلا پلا کہ بس اب تابِ انتظار نہیں

سنوار گلشنِ ہستی سنوارنے والے
بہارِ عمرِ دو روزہ کا اعتبار نہیں

دیگر

مست نظروں سے زیادہ مئے سرجوش نہیں
لُٹ رہا ہے مرا دل اور مجھے ہوش نہیں

اے مری قبرِ شکستہ کے مٹانے والے
آج بھی میں ترے احساں سے سُبکدوش نہیں

صبحِ محشر کو بھی جلتے ہوئے دل روتے ہیں
یہ وہ شمعیں ہیں کسی وقت جو خاموش نہیں

نشہ کا جوش ہے ساقی دل و دیں سب صدقے
یاد رکھنا مگر اتنا کہ مجھے ہوش نہیں

کیفِ غم آنسوؤں کے ساتھ تھا وہ خشک ہوئے
جام بیکار ہیں جب بادۂ سرجوش نہیں

قبلہ رو ہوکے کئے پائے صنم پر سجدے
ہوش کی باتیں کئے جاتا ہوں اور ہوش نہیں

نقشِ عبرت ہے مری لاش عدم والوں میں
کون ہے وہ جو مجھے دیکھ کے خاموش نہیں

نزع کا وقت ہے دنیا مری ہوتی ہے تمام
ہاں دکھا جلوہ کہ تو وعدہ فراموش نہیں

ناصریؔ تک رہی ارمانِ شہادت کی نمود
امتحاں گاہ میں اب کوئی کفن پوش نہیں

۵۔ دسمبر ۱۹۳۰ء

پیامِ عیش کے روز آسماں سے آتے ہیں
مَیں جانتا ہوں یہ ناوک جہاں سے آتے ہیں

دلوں کے پار غریبوں کی آہ ہوتی ہے
کہ جیسے تیر کشیدہ کماں سے آتے ہیں

نہ پوچھ حشر میں دیر و حرم کے ہنگامے
ترے مٹائے ترے آستاں سے آتے ہیں

دلوں کو حُسن سے کھینچا ادا سے تڑپایا
نگاہ دوست! یہ فتنے کہاں سے آتے ہیں

جہاں ہے جوشِ تجلّی۔ جہاں تھا دورِ الست
ہمارے ساغر و مینا وہاں سے آتے ہیں

قفس میں چین ملے گا بُلا نصیبوں کو
بہت ستائے ہوئے آشیاں سے آتے ہیں

وہیں ہے عشق کی لذّت۔ وہیں ہے حسن کی سیر
وہیں چلو گل و بلبل جہاں سے آتے ہیں

وفا کے نام پہ دشتِ بلا میں ہمو طنو
جو لُٹ گیا تھا ہم اس کارواں سے آتے ہیں

جو سوئے ہند مدینہ سے ناصری آئے
تو پھر کہیں گے کہ باغِ جناں سے آتے ہیں

۵- نومبر ۱۹۲۲ء

تم تو نہ دیکھ سکتے تھے اُجڑے دیار کو
مایوس کیوں کیا دلِ امّید وار کو

سب سے چھپائے ہوں مژۂ اشکبار کو
مُنہ پر لئے ہوں دامنِ ابرِ بہار کو

لالے کے پھول توڑ کے پھینکے جو باغ میں
وہ کیا سنبھالے میرے دلِ داغ دار کو

میں جانتا ہوں حسن پہ پیدا کسی کا ہو
میرے گلے میں ڈالدو پھولوں کے ہار کو

نقشِ وفا کہیں۔ کہیں حسرت کے ہیں نشاں
عبرت سے دیکھتا ہوں ترے رہگذار کو

دل کو طلسم عشق میں لا کر پھنسا دیا
جیسے گرائے گھیر کے کوئی شکار کو

دیوانگی میں دل۔ وطن آوارہ ہوگیا
ڈھونڈھوں کہاں میں جا کے غریب الدیار کو

خونناب غم میں نشتر مژگاں ڈبوے ہیں
چھیڑیں گے آج ہم رگ ابر بہار کو

سو یاد آیا اور کبھی فرہاد ناصرؔی
بجنور میں جو دیکھ لیا کوہسار کو

۱۹، جولائی ۱۹۲۵ء

زہر سے بھر کے مری عمر کے پیمانے کو
بند ساقی نے کیا عیش کے میخانے کو

کششِ حسن خدا داد دہائی تیری
شمع نے کھینچ لیا بزم میں پروانے کو

عقل والے مجھے پابند بہ زنداں سمجھے
میں نے ہر گوشے میں پیدا کیا ویرانے کو

حیف یہ زخم جگر اور یہ ساون کی ہوا
کاش اب زہر پلا دیں ترے دیوانے کو

عشق کامل ہو تو ہو جاتا ہے انجام بخیر
شمع کے پاس جگہ مل گئی پروانے کو

طور کو شعلہ مرے دل کو تمھاری تصویر
کچھ نہ کچھ سب کو دیا دیکھ کے پیمانے کو

وعدۂ دید نہ گر حشر پہ ہوتا موقوف
طول دیتا نہ کبھی ہجر کے افسانے کو

نیک و بد عشق کی دنیا کے بہت کچھ دیکھے
خوب سجدے کئے دن رات صنم خانے کو

ہے پسند ان کو جو زنجیرِ جنوں کی آواز
روز آنکھوں سے لگاتا ہوں ہر اک دانے کو

آج زنداں میں کوئی درد سے چلّاتا ہے
کسی بیدرد نے چھیڑا کسی دیوانے کو

شہر والوں نے تو رسوا کیا تشہیر کیا
دشت غربت نے چھپایا ترے دیوانے کو

مے پرستی کے ہمیں یاد ہیں سارے آداب
جھکتے ہیں خم کی طرف چوم کے پیمانے کو

ناصرؔی حسن کی دنیا نے ستایا ناحق
ہم تو آئے تھے دلِ زار کے بہلانے کو

۶۔ دسمبر ۱۹۱۷ء

ابھی بوئے وفا لائیں ہوائیں کوئے قاتل کی
یہ کیا نیرنگِ عالم ہے الٰہی خیر ہو دل کی

نہ پوچھو وجہ کچھ مجھسے شکستِ رنگ محفل کی
بہت نیرنگیاں دیکھوگے اس ٹوٹے ہوئے دل کی

رُلاتا ہے مجھے حالت دگرگوں ہوگی محفل کی
سنبھل ظالم کہ یہ فریاد ہے دُکھتے ہوئے دل کی

وہ برقِ طور ہو یا چاک ہو دامان یوسف کا
کہیں تاثیر ہے دل کی کہیں تصویر ہے دل کی

بڑے دعوے سے نازک ہاتھ اُٹھا ہے سخت جانوں پر
بڑھ اے شوقِ شہادت بات رکھ لے آج قاتل کی

کرم کر اے تونگر! بحرِ رحمت میں اُٹھیں موجیں
نظر کر کیا بتاتی ہیں لکیریں دستِ سائل کی

۲۵- دسمبر ۱۹۲۸ء

ٹھنڈی ہوا ہے نکہتِ گیسوئے یار ہے
آ ساقیا کہ سیرِ شبِ انتظار ہے

اک لالہ زار قبر دلِ داغدار ہے
کتنی نظر فریب یہ فصلِ بہار ہے

ہم منتظر ہوں جام کے تُو آنکھ پھیر لے
یہ بھی عجیب گردشِ لیل و نہار ہے

یہ دل کے ولولے ہیں جو مجبور کرتے ہیں
ہاں جبر اگر کریں تو بڑا اختیار ہے

۲۳۔ دسمبر ۱۹۱۹ء

آپ کہئے وحشتِ دل نے نہ کچھ تاثیر کی
عرش تھرایا جو کڑیاں ہل گئیں زنجیر کی

ہم تو سمجھے تھے کہ دنیا سیر گاہِ حسن ہے
عشق نے مارا دُہائی مالکِ تقدیر کی

کیا ستم اہلِ محبّت پر ہوا ۔ کھلتا نہیں
رات بھر آواز آئی کان میں تکبیر کی

بزم میں اُڑتے ہوئے پروانوں کے پر دیکھ لو
یہ نہ پوچھو اس نے میری لاش کیوں تشہیر کی

وہ بھرا گھر جس کو کہتے تھے دلِ پُر آرزو
یوں مٹا آخر کہ حاجت پھر سے ہے تعمیر کی

عرش تھرّایا اُدھر زلفوں نے بل کھایا اِدھر
بیقراری بڑھ گئی شاید دلِ دلگیر کی

آپ اگر چپ ہوں تو گویا ناز کے عالم میں ہیں
ہم کریں نالے تو قسمت خانۂ زنجیر کی

جانکنی ہے قیدِ ہستی سے رہائی کے لئے
ٹوٹتی جاتی ہیں کڑیاں خود بخود زنجیر کی

دل بجھا یا بُجھ گیا زندانِ الفت کا چراغ
ناصری دیکھو اُداسی خانۂ زنجیر کی

۲۲ - اکتوبر ۱۹۲۰ء

اک بات پوچھنی ہمیں اہلِ نظر سے ہے
یہ جوئے خوں ہے کیا جو رواں چشمِ تر سے ہے
بجلی گرائی کیوں یہ گلہ ابرِ تر سے ہے
روتا بھی ہے۔ عناد بھی اک مشتِ پر سے ہے
دل بیقرار سوزشِ زخمِ جگر سے ہے
اک ربط راہ رو کو رفیقِ سفر سے ہے
دیر و حرم میں شمع جلانے نہ جائیں گے
اپنی تو لو لگی ہوئی اک بے خبر سے ہے
یوں تو ہیں دل کے ٹکڑے یہ لعل و گہر نہیں
امید قدر اگر ہے تو اہلِ نظر سے ہے
مرجاؤں گا نہ پوچھ مرے دل کا ماجرا
فریاد روزِ حشر یہی دادگر سے ہے
اب کیا بتائیں ہجر کی شب کس طرح کٹی
روشن ہمارا حال چراغِ سحر سے ہے

ہنگامہ تھا تو نالۂ دل کے اثر سے تھا
دنیا اُداس بعد مرے کس اثر سے ہے
سمجھا نہ کوئی حشر میں ہم کیوں تڑپ گئے
اتنا گلہ ہمیں تری ترچھی نظر سے ہے
بیمار غم کی صبح کٹے خیر سے خدا
چہرے کا رنگ اُڑا ہوا پچھلے پہر سے ہے
ہر مشت خاک مست ہے اللہ کی پناہ
وہ کیفیت عیاں مرے خونِ جگر سے ہے
گوشہ میں بھی نہ چین ملا تیری بزم میں
اتنا گلہ ہمیں تری ترچھی نظر سے ہے
تعقید سے غزل نہ بچی آج ناصری
یہ معذرت ضرور ہی اہلِ نظر سے ہے

۸-اپریل ۱۹۲۴ء

فتنہ پردازی مرے جوشِ جنوں کا کام ہے
جو مری باتیں سمجھتا ہے وہی بدنام ہے

زاہدوں کی شرع میں جسکا قیامت نام ہے
اپنے میخانے میں وہ ایک شورِ بے ہنگام ہے

ہجر کی شب ایک میں ہوں اک دلِ ناکام ہے
مردنی چھائی ہوئی ہے اور خدا کا نام ہے

آنکھوں میں آنسو بھرے پھرتے ہیں میخانے میں ہم
خوش رہیں وہ ہاتھ میں جنکے چھلکتا جام ہے

اے چراغ کنج فرقت آج تو ہی ساتھ دے
دل مرا بجھنے لگا اور ابتدائے شام ہے

نزع کی ہچکی سے کھل جاتے ہیں اسرارِ فنا
دم نکلتا ہے مگر لب پر تمہارا نام ہے

بلبلوں کو باغ میں جس گل نے دیوانہ کیا
عاشقوں کے خون کا وہ اک چھلکتا جام ہے

زندگی کے ساتھ ہے ہنگامۂ یاس و امید
مرنے والوں کے لئے آرام ہی آرام ہے

دل کے ٹکڑے جمع کرنے کا مزا ابتلا میں کیا
پھول دامن میں بھرے پھرنا تمھارا کام ہے

مرنے والے سو رہے ہیں محفلِ تصویر ہیں
یعنی اس شہرِ خموشاں میں بہت آرام ہے

مجھکو حیرت ہے کہ سب ہیں میرے دل کے دادخواہ
یعنی اک اُجڑی ہوئی بستی کا اتنا نام ہے

آج جن نالوں سے نیند اُڑنے لگی ہے آپ کی
دل میں اک دن کام کر جانا انھیں کا کام ہے

کثرتِ افکار و فکرِ شعر یہ کیا ناصری
ایسے عالم میں غزل گوئی خیالِ خام ہے

۱۹-جون ۱۹۲۲ء

بہارِ عشق کا ہر رنگ میں اک کام ہوتا ہے
کوئی دیوانہ ہوتا ہے کوئی بدنام ہوتا ہے

عجب عبرت کا عالم نزع کا ہنگام ہوتا ہے
خموشی چھائی ہوتی ہے خدا کا نام ہوتا ہے

قیامت خیز روزِ ہجر کا انجام ہوتا ہے
ادھر دل اُس طرف سوزاں چراغِ شام ہوتا ہے

بہار آتے ہی ہر دیوانہ آجاتا ہے صحرا میں
مری تربت پہ ہر سال اک ہجوم عام ہوتا ہے

پہونچ جاتا ہے اہلِ درد تک افسانۂ عبرت
دلِ ناکام کے نالوں سے بھی اک کام ہوتا ہے

بڑا مجمع ہے مقتل میں اشارہ کردو ابرو کا
ہمارا کام ہوتا ہے تمہارا نام ہوتا ہے

قفس والوں کے نالے سن کے جو زلفیں بناتے ہیں
وہی جانیں کہ دل کیونکر اسیرِ دام ہوتا ہے

پسینہ آگیا ماتھے پہ سب بالیں سے ہٹ جائیں
بس اب لبریز میری زندگی کا جام ہوتا ہے

بھرا آتا ہے دل اے ناصری کیوں بزم میں سنبھلو
نہیں تو آج رازِ عشق طشت از بام ہوتا ہے

۲۴- جون سنہ ۱۹۲۲ء

بسر کر دینگے تنہا شامِ ہجراں دیکھنے والے
رہیں آباد یا رب بزمِ جاناں دیکھنے والے

کہاں محفل میں وہ عشرت کے ساماں دیکھنے والے
کہاں بیکس در و دیوارِ زنداں دیکھنے والے

مرے لاشے کو خاک و خوں میں غلطاں دیکھنے والے
ترے خنجر بکف ہاتھوں کے قرباں دیکھنے والے

سمجھ کیونکر اندھیری رات تارے گن کے کٹتی ہے
شبِ مہتاب میں سیرِ چراغاں دیکھنے والے

اندھیری شب ہے تنہائی ہے دل کے داغ روشن ہیں
ادھر بھی آ ذرا سیرِ چراغاں دیکھنے والے

بہت مشکل ہے خونِ دل سے رنگنا اپنے دامن کا
سُن اے نقش و نگارِ بزمِ جاناں دیکھنے والے

پھونچ منزل پہ اپنی ورنہ تیری نیند جائیگی

خدا حافظ مری شام غریباں دیکھنے والے

چمک پیدا ہے کوہِ طور پر دنیا لرزتی ہے

سنبھالیں دل کو اپنے روے جاناں دیکھنے والے

مقابل تیرے وقتِ صبح سورج تک لرزتا ہے

ذرا دیکھ آسماں اے داغِ ہجراں دیکھنے والے

ہوائے عشق جس دم چل گئی فرہاد و مجنوں کیا

ہوے برباد سب کوہ و بیاباں دیکھنے والے

یہی اے ناصری نالوں سے گردوں کو ہلاتے ہیں

یہی جو سقفِ زنداں کی ہیں کڑیاں دیکھنے والے

۲۴-جون سنہ ۱۹۲۲ء

آسماں پر ابر جب چھانے لگے
ہم قفس سے سر کو ٹکرانے لگے

داستاں گو نے سنایا حالِ قیس
کیا کہوں کیا کیا خیال آنے لگے

آسماں کانپا تمھارا دل ہلا
اب تو نالے عرش تک جانے لگے

جب مرے دل کا تڑپنا بڑھ گیا
اور گیسوان کے بل کھانے لگے

آہ اور وہ بھی کسی مظلوم کی
دل تو دل ہے عرش تھرانے لگے

جلوہ آرائی کے عالم کو نہ پوچھ
سنتے ہی سنتے نہ غش آنے لگے

ناصری کب تک یہ دل کی داستاں
ہم تو ان باتوں سے گھبرانے لگے

۲۶- جون ۱۹۲۳ء

ٹکڑے جگر کے کردئے آنکھ اشکبار کی
تصویریں کھینچ دی ہیں دلِ بے قرار کی

اک یادگارِ غم ہے اجل خاکسار کی
عبرت سے لَو لگی ہے چراغِ مزار کی

بلبل قفس کو رنگ دے ٹکرا کے سر کو آج
گُل سیر کرنے نکلے ہیں جوشِ بہار کی

پھر آج کوئے دوست میں ہے تہنیت کی دھوم
ٹُوٹی ہے آس پھر کسی امّیدوار کی

دل کے مزے سے کیفیتِ حسُن و عشق ہے
میرے گلے میں شان ہے پھولوں کے ہار کی

اُبلا ہے بن کے لالہ رگِ سنگ سے لہو
جادو بھری نظر ہے عروسِ بہار کی

مارا گیا ہے وادیِ غربت میں دل مرا
اُڑتی ہے خاک آج ہر اک رہگذار کی

یہ زخمِ دل تو وہ ہے کہ پتھّر بھی رو دئے
مجھکو نہ دیکھو سیر کرو آبشار کی

جس سرزمیں پہ پھول ہیں سوکھے پڑے ہوئے
ڈھونڈھو وہیں ہے قبر دلِ داغدار کی

کیوں بار بار زلفوں کو جنبش ہے دیکھئے
حالت یہ بگڑی کس کے دلِ بیقرار کی

دل جب سے میں نے آپ کے قبضے میں دے دیا
مجبوریوں میں شان ہے ہر اختیار کی

اے ساکنانِ نجد ذرا دل سنبھال لو
آتی ہے لاش ایک غریب الدیار کی

بجلی کڑک کڑک کے گری شب کو باغ میں
اہلِ قفس دُہائی ہے فصلِ بہار کی

ملتی نہیں کسی کی نظر اب تو ناصریؔ
اللہ ری گردشیں مرے لیل و نہار کی

۳- نومبر ۱۹۲۲ء

ہوں بے قرار گریۂ بے اختیار سے
لپٹا ہوا ہوں دامنِ ابرِ بہار سے

اُبھرے جگر کے داغ ہوائے بہار سے
لالے کے پھول نکلے ہیں سنگِ مزار سے

بیٹھا ہے تھک کے وادیِ غربت میں دل مرا
اے موت مل لے آ کے غریب الدیار سے

میرا قفس نہ جانبِ گلزار لے کے جاؤ
ہو جائیگا جنون ہوائے بہار سے

اے چشمِ اشکبار بجھا میرے دل کی آگ
شُعلے بھڑک رہے ہیں ہوائے بہار سے

یوں دل کی آرزو مرے دل سے جدا ہوئی
چُھٹتی ہے جیسے لاش کسی سوگوار سے

کچھ روشنی سی رات کو تھی آشیاں کے سمت
خالق بچائے خوف ہے فصلِ بہار سے

تھی آب و تاب حسن سے نشو و نمائے عشق
دنیا سے ہم اُٹھے جو اُٹھے کوئے یار سے

چادر چڑھانے آج کوئی آئے گا ضرور
جھڑنے لگے ہیں پھول چراغِ مزار سے

اے جانے والے ہاتھ میں لے دل غریب کا
ٹھکرا کے یوں ہمیں نہ اُٹھا رہگذار سے

اتنا مزا شباب کا اب بھی ہے ناصری
دل باغ باغ ہوتا ہے پھولوں کے ہار سے

۴- نومبر ۱۹۲۲ء

وادیِ ایمن کا اُس کے آگے کیا مذکور ہے
جس کے دل کا اک بُجھا نقشہ چراغِ طور ہے
ایک وہ ہیں جن کی محفل ہر گھڑی پُرنور ہے
ایک ہم ہیں عمر جس کی اک شبِ دیجور ہے
قابلِ عبرت جہاں میں عاشقِ رنجور ہے
زندگی جس سے پریشاں موت جس سے دور ہے
میرے جلتے دل کی بیتابی نہ پوچھو اے کلیم
اُڑ گیا تھا جس کا اک ذرہ وہ برقِ طور ہے
دل کو چھیڑا آپ نے آنکھوں سے خوں بہنے لگا
ہم نہ کہتے تھے کہ یہ رستا ہوا ناسور ہے
اپنے عالم میں نہیں کچھ - گر ترا جلوہ نہیں
اک چراغِ کنجِ فرقت ہے تو وہ بے نور ہے
کوئی دیکھے ہجر کی شب سینۂ سوزاں کے داغ
تابشِ خورشیدِ محشر تو بہت مشہور ہے
اُس کے جلوے عام نظروں میں سما سکتے نہیں
لوگ کہتے ہیں وہ اپنے حسن پر مغرور ہے

آفتابِ حسن جب چمکا قیامت آگئی
عشق کے عالم میں سوسو بار دل محشور ہے

آپ مجھکو دل فروشی پر نہ چھیڑا کیجئے
حضرتِ یوسف کا قصّہ تو بہت مشہور ہے

بندگی کا شوق ہے اور بندگی بیچارگی
کون ہے مختار پھر۔ بندہ اگر مجبور ہے

جان سے میری رگِ جاں تک ہے اک عالم کا فرق
جس کو سب نزدیک سمجھے ہیں وہ اتنا دور ہے

تھا کہیں انجام سے آغازِ الفت خوشنما
دل جو تھا پہلو میں اب رستا ہوا ناسور ہے

پڑھ غزل اک اور اسی آہنگ میں اے ناصریؔ
چھیڑنا سازِ محبّت کا اگر منظور ہے

دیگر

دل کو پیدا کرتے ہی کیوں عشق کا مذکور ہے
میرے خالق کیا مرا جینا نہیں منظور ہے

خونچکاں سینے میں اپنے اک دلِ رنجور ہے
جس کے ہر قطرے میں دنیا عشق کی معمور ہے

کس کی روح آئی یہ کس کی پیاس کا مذکور ہے
خُم ہر اک ہلنے لگا ہر ایک شیشہ چور ہے

دل مرا جس وادیِ غربت میں آوارہ ہوا
اس کا ہر اُڑتا ہوا ذرّہ چراغ طور ہے

ہم نہ کہتے تھے کہ داغِ بیدلی لائیگا رنگ
دل کہاں۔ پہلو میں اک رِستا ہوا ناسور ہے

زندگی پر شورِ ماتم۔ موت پر سامانِ جشن
یہ ہے دنیا عشق کی اس کا یہی دستور ہے

بجلیاں شب بھر تڑپتی ہی نظر آتی ہیں یاں
کس کا یہ سنگِ لحد اے رہروانِ طور ہے

یاد آتے ہیں وہ دن میلے لگے رہتے تھے جب
نالہ زن روحوں سے اب کوچہ ترا معمور ہے

آج کچھ قطرے لہو کے ٹپکے دودِ آہ سے
اب میں سمجھا۔ میرے جلتے دل میں اک ناسور ہے

اے اسیرِ حرص چھوڑ آوارگی کو پھر بتائیں
کنج عزلت میں خزانہ کس جگہ مستور ہے

نیند کیا ہے۔ موت کی اک لہر۔ وہ بھی بے ثبات
موت کیا ہے ایک گہری نیند جو مشہور ہے

جلوہ آرائی مبارک لیکن اتنا سوچئے
دل کی کیا ہستی ہے اور کیا چیز سنگِ طور ہے

یاد کرتا ہے تمھیں بجنور میں بھی ناصری
دل سے ہے نزدیک گو ظاہر میں دلّی دور ہے

۳- نومبر ۱۹۲۴ء

اہل دل کے واسطے در پردہ اک تعزیر ہے
یوں تو اے بیباک میرا دل ہے تیرا تیر ہے

یاد آتے ہیں کسی کو آج ہم مدّت کے بعد
کی طلب زنداں سے زنگ آلود جو زنجیر ہے

اے ہجوم یاس! عبرت کا مرقّع دیکھ لے
دل کہاں پہلو میں؟ ہاں! اک درد کی تصویر ہے

ایک شعلہ تھا کہ فرقت میں بھڑک کے رہ گیا
کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کہاں دلگیر ہے

بسترِ غم پر پڑا ہوں ہجر کی شب کاٹنے
لب پہ نالے جانستاں ہیں زیر سر شمشیر ہے

فصل گل میں تیرے دیوانوں کے تیور الاماں
ہاتھ میں چاکِ گریباں پاؤں میں زنجیر ہے

۶- دسمبر ۱۹۲۴ء

کیوں دل آویز نہ اے شوخ وہ پیکاں ہو جائے
دل میں جو ڈوب کے اُبھرے تو رگِ جاں ہو جائے

دل صد چاک کی تصویر نمایاں ہو جائے
سرِ بالیں جو تری زلف پریشاں ہو جائے

کچھ نہیں ایک نگاہِ غلط انداز سہی
رحم کر رحم کہ مشکل مری آساں ہو جائے

حُسن چھپنے کا نہیں دید کی قوّت ہے اگر
سات پردوں میں چھپا دو تو نمایاں ہو جائے

میرے مالک دلِ دیوانہ کی فریاد نہ سُن
سرِ محشر نہ کوئی چاک گریباں ہو جائے

سانس اُکھڑی مری شیرازۂ ہستی ٹوٹا
کیا عجب خاک کا ہر ذرّہ پریشاں ہو جائے

چادریں خاک کی لے کر جو بگولے آ جائیں
دشت غربت میں مرے دفن کا ساماں ہو جائے

جھلملاتا ہوا تارا شبِ غم کا ڈوبا
دل کے ماتم میں سحر چاک گریباں ہو جائے

دور ہیں سرحدِ ادراک سے تیرے جلوے
دل کے آئینے کو جو دیکھ لے حیراں ہو جائے

اشک بہنے ہیں جو صورت تری نظروں میں پھرے
روکشِ صبحِ بنارس شبِ ہجراں ہو جائے

ناصری شوقِ حرم اور یہ شوریدہ سری
کہیں آزردہ نہ وہ دشمنِ ایماں ہو جائے

۲۶ - مارچ ۱۹۲۵ء

فلک سے ٹوٹ کے تارے سرِ مزار آئے
اندھیری رات میں یہ تم کسے پکار آئے

گلوں کے نام پہ سر پھوڑتے ہیں اہلِ قفس
جہاں چمن ہوں الٰہی وہیں بہار آئے

صدا لگانے ترے در پہ تو گئے تھے مگر
ہم اپنے ہی دلِ بیتاب کو پکار آئے

نگاہیں نیچی ہیں آنکھوں سے اشک جاری ہیں
کسی غریب کو وہ قبر میں اُتار آئے

بہار آئی ہے وحشت کا دَور دَورہ ہے
کوئی ذرا درِ زنداں پہ بھی پکار آئے

ہے بزمِ ناز میں آساں بہت نظارۂ دوست
مگر جو آئے ذرا دل سے ہوشیار آئے

کفن ہٹایا ہے چہرے سے قبر میں ہم نے
کہ شاید اب تو نظر صورتِ قرار آئے

سنا ہے حشر بھی اک نام جلوہ گاہ کا ہے
نقاب چہرے سے اُلٹو تو اعتبار آئے

نشانِ قبر مٹے ناصری کہ نام مٹے
نہ حاسدوں کے بھی دل پر مگر غبار آئے

فروری ۱۹۲۲ء

روئیں میرے غم میں روحیں قیس اور فرہاد کی
کوہ و صحرا سے صدا آنے لگی فریاد کی

گل پہ گلچیں کی نظر ہے دام پر صیاد کی
"خیریت[1] ہو یا الٰہی بلبلِ ناشاد کی"

ذبح ہوتے ہی طلسمِ عشق کی حالت کھُلی
خون کے ہر قطرے میں تصویر تھی جلاد کی

سنتے ہیں دنیائے حسرت کی زیارت گاہ ہے
وہ زمیں۔ تربت جو تھی اک کشتۂ بیداد کی

ہوش میرے اُڑ گئے وحدت میں کثرت دیکھکر
شیشۂ دل ٹوٹتے ہی میں نے اک فریاد کی

میری تربت کو مٹایا حسرتوں کا خوں کیا
آج اک آباد بستی آپ نے برباد کی

---

[1] مصرع طرح۔

اک طرف ہم ہیں قفس میں اک طرف پھولوں کا ڈھیر
دیدنی ہے آج زینت خانۂ صیاد کی

دوستی دنیا میں ہے دکھ درد کی شرکت کا نام
آگیا منہ کو کلیجہ دل نے جب فریاد کی

خوش ہوئی میرا لہو پی کر زمینِ قتل گاہ
ذرے ذرے سے صدا آئی مبارکباد کی

کاوشِ غم دیکھئے بنتے ہی جوئے شیر کے
سیل جاری ہو گئی خونِ سرِ فرہاد کی

ناصری مقتل میں آوازیں لگاتا ہے یہی
ہے کفن پوش اک ادھر بھی خیر ہو جلاد کی

۱۶ - مئی ۱۹۲۵ء

۱

میری خاطر خواہ مل جاتا اگر مدفن مجھے
دشت غربت کیوں چھپا رکھتا نہ دامن مجھے

گوشۂ راحت میں بھی ہونے لگی اُلجھن مجھے
کس نے یہ رو کر پکارا ہے سرِ مدفن مجھے

زخم دل کو زہر ہے صیّاد ساون کی ہوا
کیوں قفس میں لے چلا ہے جانبِ گلشن مجھے

پھر شبِ غم میں ہوا روشن دل ویراں کا داغ
پھر نظر آیا چراغِ وادیِ ایمن مجھے

لالہ و گل کی میں رو رو کے چڑھاتا چادریں
کاش مل جاتا دلِ پر داغ کا مدفن مجھے

کیا عجب ہے منزلِ تسلیم طے ہو جائے اب
قتل گہ تک کھینچ لائی ہے تری چتون مجھے

آگ دل میں تھی تو ہر ذرّے سے پیدا تھے شرار
میں جہاں پہونچا ملا اک وادیِ ایمن مجھے

عالم وحشت کی حد اب بھی نظر سے دور ہے
یوں تو کوسوں کھینچ لایا دشت کا دامن مجھے

واسطہ کیا تھا اثر سے نامرادی کو مری
کوئی سکھلاتا ہے طرزِ نالۂ و شیون مجھے

وہ بھی کیا دن تھے کہ میں روتا تھا ہجرِ دوست میں
آج دنیا ہے کہ روتی ہے سرِ مدفن مجھے

فصلِ گل میں توبہ کیا ٹوٹی کہ دنیا اور تھی
اب تو ہر جانب نظر آنے لگے گلشن مجھے

دشتِ غربت میں ہے لاشہ اور ہجومِ یاس ہے
کون لے جائے الٰہی تا سرِ مدفن مجھے

عمر گذری خانۂ صیاد میں یوں ناصری
رو دیا جب یاد آیا باغ اور ساون مجھے

۱۶-جون ۱۹۲۵ء

جنازہ آج اک وحشی کا اُٹھا طرفہ ساماں سے
لپٹ کر حسرتیں روئیں درودیوار زنداں سے

انھیں ضد ہے دلِ مایوس کی تصویر دیکھیں گے
کہو کیا کام شمعِ کشتۂ گورِ غریباں سے

کشاکش میں امید و یاس کی میرا سفینہ ہے
کہ ٹکراتا ہے ساحل سے اگر بچتا ہے طوفاں سے

ہزاروں حسرتیں ہیں دفن اور سکتے کا عالم ہے
ملی ہے دل کی بستی سرحدِ شہرِ خموشاں سے

ستارہ صبح کا نکلا ہوا ہے نیند آتی ہے
کہو کیا پوچھنے آئے ہو اب بیمار ہجراں سے

مرا جوشِ جنوں دیر و حرم دونوں میں رسوا ہے
وہی اچھے تھے جو لپٹے رہے صحرا کے داماں سے

کھٹک رہ رہ کے دل میں ہوتی ہے یا تیر لگتے ہیں
لڑی ہیں کس کی نظریں روزنِ دیوار زنداں سے

یہ آب و تاب یہ کافر ادائیں۔ لے معاذ اللہ
جو منصوریؔ پہ آئے ہاتھ دھولے جان و ایماں سے

اِدھر بھی اک نظر او سیرِ صحرا دیکھنے والے
یہ تنہائی اور اتنی بے رُخی گورِ غریباں سے

پسِ مردن کھُلیں آنکھیں تو حیرت خیز منظر تھا
کہ جیسے چونک پڑتا ہے کوئی خوابِ پریشاں سے

تمھیں دیکھو کہ دنیا کیا تماشا گاہِ عبرت ہے
میں اور باتیں کروں پھروں چراغِ شامِ ہجراں سے

عجب انداز سے اے ناصریؔ دل نے بٹھایا ہے
قیامت تک نہ اُٹھیں گے زمینِ کوئے جاناں سے

نوٹ۔ منصوری میں یہ غزل اک مشاعرہ میں پڑھی گئی۔

۵- جولائی ۱۹۲۵ء

جسے نالہ سمجھتے ہو وہی دل کی سنانی ہے
تڑپ خود کہہ رہی ہے ماتم مرگِ جوانی ہے

ہو کیونکر عشق کی دنیا سے رغبت حسن والوں کو
ہماری شام غربت آپ کی شام جوانی ہے

حیات و موت پر قبضہ ہے ابرو کے اشاروں کا
خدا کی شان دیکھو باڑھ پر ان کی جوانی ہے

یہ قتلِ عام ظالم اور یہ مجمع جاں نثاروں کا
یہ دل یہ کج ادائی کیوں نہ ہو آخر جوانی ہے

بجھے میرا دلِ سوزاں تو بس اندھیر ہو جائے
یہی اے فتنہ گر چشم و چراغِ زندگانی ہے

۲۹- نومبر ۱۹۲۶ء

دیکھئے کس حسن سے پوشیدہ غم کا راز ہے
تیر میرے دل میں اور پردے میں تیر انداز ہے

شان سے اب ہو گی قائم یادگارِ حسن و عشق
ہم کو دل پر آپ کو اپنی ادا پر ناز ہے

میرے دل میں ہے چمک اور برق کوہِ طور پر
جیسا موقع ہے جہاں۔ ویسا ترا انداز ہے

مُشت پر میرے اُڑے گلزار میں چاروں طرف
مر کے چھوٹا ہوں اور اتنی طاقتِ پرواز ہے

وادیِ ایمن کا نغمہ اور لبِ منصور پر
ہم نہ کہتے تھے یہ پہچانی ہوئی آواز ہے

کچھ نہیں دیر و حرم اللہ رے فرطِ نیاز
جو ترا در ہو فقیروں کی وہیں آواز ہے

سوچئے تو کس نزاکت سے وہ دل توڑا گیا
نوحہ خواں جس پر شکستِ رنگ کی آواز ہے

ہو گیا برباد جس وحشت بلا میں دل مرا
اس کے ہر ذرّے سے روشن بارگاہِ ناز ہے

آفتابِ حشر چمکا چاہتا ہے ناصرؔی
موے سر کا رنگ بدلا صبح کا آغاز ہے

۶- دسمبر ۱۹۲۵ء

تو ہی اے بلبل بتا نالوں سے کچھ حاصل بھی ہے
ایک گل کی یاد میں نالاں ہمارا دل بھی ہے
ہے جوانی باڑھ پر شوخی پہ وہ مائل بھی ہے
ناصری دیکھو تو پہلو میں تمہارے دل بھی ہے
ہمارا ان کی مسیحا بھی ہے اور قاتل بھی ہے
اب تو مر جانا ہمیں آساں بھی ہے مشکل بھی ہے
کشتیِ عمرِ رواں ڈوبے تو ہو غم سے نجات
درد کے طوفاں میں پنہاں دامنِ ساحل بھی ہے
سخت راہِ حشر ہے منعم ذرا ہمّت تو کر
دستگیری کے لئے حاضر کفِ سائل بھی ہے
دادخواہوں سے بنا محشر بھی آخر کوئے دوست
حسن کی شہرت بھی ہے اور شکوۂ قاتل بھی ہے

رہروانِ عشق کی ہمت بھلا کیونکر بڑھے
راہ میں کانٹے بھی ہیں اور دورئ منزل بھی ہے

نزع کی حالت بھی اک طوفان حسرت خیز ہے
ہے تلاطم میں سفینہ سامنے ساحل بھی ہے

چاند تارے ڈوب کے دریا سے نکلیں تو چھپے
منتظر صبحِ بنارس کا مہِ کامل بھی ہے

جانکنی میں یہ صدا شہرِ خموشاں سے سنی
ناصری ہشیار رہنا اور اک منزل بھی ہے

۱۳ - دسمبر ۱۹۲۵ء

خون سے صفحۂ گردوں پہ رقم ہوتا ہے
عبرتِ کون و مکاں قصۂ غم ہوتا ہے

کاروانِ دلِ بیتاب کو لوٹا کس نے
دیر سے شورِ فغاں تا بہ حرم ہوتا ہے

غیر کے ہنسنے کی آتی نہیں کانوں میں صدا
شاید اب ذکر مرا بزم میں کم ہوتا ہے

چرخ نے سیکھ لئے آپ سے اندازِ جفا
کہ مرا نام شہیدوں میں رقم ہوتا ہے

کس لئے گورِ غریباں کی طرف جاتے ہو
آج کیا ہے جو غریبوں پہ کرم ہوتا ہے

دلِ آوارہ کو اللہ سنبھالے رکھّے
بیٹھ جاتا ہے جہاں ذکرِ صنم ہوتا ہے

تو سلامت رہے عاشق کے ستانے والے
آج رخصت ترا مشتاقِ ستم ہوتا ہے

چوم لوں پائے صنم نام وفا کا لے کر
دیر سے کوچ مرا سوئے حرم ہوتا ہے

یوں زمیں پاؤں کے نیچے سے نکل جاتی ہے
سنگ راہِ طلب ایک ایک قدم ہوتا ہے

عشق کی کوفت میں نیرنگ جہاں دیکھ لئے
اس کا توڑا ہوا دل ساغرِ جم ہوتا ہے

سیکڑوں وادیِ ایمن ہیں ترے کوچے میں
لو نکلتی ہے جہاں نقش قدم ہوتا ہے

ناصرؔی مطلعِ انوار نہ ہو کیوں دنیا
جلوہ گر ماہ عرب مہر عجم ہوتا ہے

۲۴۔ جنوری ۱۹۲۵ء

حسن ہر شے کو دیا انجمن آرائی نے
لاکھ جلوے کئے پیدا تری یکتائی نے

دم خفا ہو گیا چھوڑا جو شکیبائی نے
مار ڈالا ہمیں آخر شبِ تنہائی نے

ہر چمکتے ہوئے ذرّے کی طرف جھکتا ہوں
مجھکو دیوانہ کیا ذوقِ جبیں سائی نے

ہم نہ کہتے تھے کہ دیوانہ سے اچّھی نہیں چھیڑ
خونِ دل کر دیا ظالم تری خودرائی نے

دامنِ گل بھی ہوا چاک دلِ بلبل بھی
ہر طرح فتنہ گری کی تری رعنائی نے

کیفیت اور ہے اب عرض تمنّا کیسی
پی لیا جام فنا تیرے تمنّائی نے

دلِ سوزاں کو ذرا دیر سنبھالے رہنا
مفت شکوہ کیا نظروں کا تماشائی نے

چادریں آ کے بگولوں نے چڑھائیں اکثر
موت روشن کی مری بادیہ پیمائی نے

جو ہوا صاعقۂ طور سے پورا نہ کلیم
وہ لیا کام تصوّر سے تماشائی نے

وہ مرے نالے وہ افلاک کا تھرّانا
حشر دکھلا دیا طولِ شبِ تنہائی نے

تا بہ زنداں اثرِ جوشِ بہار آ پہونچا
وہ کیا چاک گریباں ترے سودائی نے

اب تو ہنگامۂ محشر کا خدا حافظ ہے
قصد بڑھنے کا کیا ہے مری رسوائی نے

دل مرا جانبِ پیمانہ کھنچا جاتا ہے
توبہ توڑوائی ہے ساقی تری انگڑائی نے

ناصری قبر پہ عبرت کے لئے لکھوا دو
طول کھینچا ہے یہاں تک شبِ تنہائی نے

۵- دسمبر ۱۹۲۶ء

صید گھائل ہو گیا۔ صیّاد کیوں مشکل میں ہے
جو تری چٹکی میں ناوک ہے وہ میرے دل میں ہے

ناز سے مُنہ پھیر کر کیوں مجھکو بسمل کر چلے
کیا مرے چہرے سے ظاہر ہے جو میرے دل میں ہے

دیکھئے دارِ فنا میں کون پہچانے ہمیں
جو لبِ منصور پر تھا وہ ہمارے دل میں ہے

روشنی جو دیدۂ یعقوب سے جاتی رہی
حسن یوسف کی چمک بن کے کسی کے دل میں ہے

دشت پیمائی جنوں ہے قیس دیکھ اپنی طرف
پردۂ محمل میں جو ہے وہ حجابِ دل میں ہے

۹۔ فروری سنہ ۱۹۲۷ء

جب سُنے ارماں دلِ ناکام کے
مر گئے ہم تو کلیجہ تھام کے

الوداع اے شوقِ پرواز الوداع
ہم ہوئے خوگر قفس اور دام کے

میرے غم کی داستانیں سُن چکے
گِن لئے ٹکڑے دلِ ناکام کے

روز کی چھیڑ اور برقِ حسن سے
حوصلے دیکھو دلِ ناکام کے

نام ہیں صبحِ ازل شامِ ابد
عشق کے آغاز اور انجام کے

آج بالیں پر ہے خلقت کا ہجوم
تم ذرا آنا کلیجہ تھام کے

تھیں کبھی ہر دم نویدیں عیش کی
اب تو دن ہیں موت کے پیغام کے
ہاں رخِ بیمار غم تو دیکھئے
رنگ کیا ہیں گردشِ ایّام کے
جان آئی لب پہ یہ کہتی ہوئی
آفتاب آیا کنارے بام کے
ہاں نگاہِ مست ادھر بھی ساقیا
ہم بھی ہیں ترسے ہوئے اک جام کے
ابتدا شعروں کی یوں مطلع کے بعد
ناصری عاشق ہو کس کے نام کے

غزل در صنعتِ توشیح بنام بانی مشاعرہ (پروفیسر) امرناتھ جھا

دیگر

نگاہیں تیز ہوئیں دل کے امتحاں کے لئے
یہ اہتمام اور اک صیدِ ناتواں کے لئے

ہوائے عشق میں برباد ہو گئے ہم لوگ
بنے اب اور جہاں جورِ آسماں کے لئے

قفس ہو یا ہو چمن دل وہی ہے زخم وہی
نہیں ہے قیدِ مکاں نالۂ و فغاں کے لئے

کہاں مرا دلِ زخمی کہاں سرِ فرہاد
چھڑا یہ ذکر فقط رنگِ داستاں کے لئے

نگاہِ ناز ذرا حسن سے ہو کام تمام
تڑپ رہا ہے کوئی مرگِ ناگہاں کے لئے

ہنسی گلوں میں ہو یا دل میں بجلیاں تڑپیں
بھری بہار میں ہم روئیں آشیاں کے لئے

پڑے ہیں دل پہ مرے ناصری ہزاروں داغ
سجا گیا ہے یہ گھر یادِ رفتگاں کے لئے

۲۹ ستمبر ۱۹۲۶ء

ازل میں کیوں اُٹھا تھا عشق کا بارِ گراں ہم سے
مخالف ہو گئے یارب زمین و آسماں ہم سے

گلوں کی وہ ہنسی اور وہ عنادل کے بیاں ہم سے
قفس میں آکے چھوٹے ہائے کیا کیا راز داں ہم سے

مدد شوقِ طلب اب راستہ چلنا بھی مشکل ہے
ہوئی جاتی ہے کوسوں دور گردِ کارواں ہم سے

کسی مرغِ چمن نے زخم کھا کے جب کئے نالے
تو ہم سمجھے کہ کہتا ہے ہماری داستاں ہم سے

رگِ گردن پہ ہے اللہ اکبر! تیغ قاتل کی
گلے ملتی ہے مقتل میں حیاتِ جاوداں ہم سے

بتا اے قیدیِ زنداں دلِ وحشی پہ کیا گذری
یہ پوچھا کرتی ہیں دیوار کی پرچھائیاں ہم سے

شکستہ بال و پر اے ہمصفیر ولے کے آئے ہیں
دمِ پروازیوں اُلجھیں قفس کی تیلیاں ہم سے

حرم سے دَیر تک دن رات اک کہرام برپا ہے
خدا جانے کہ میت دل کی چھوٹی تھی کہاں ہم سے

زمانے نے بھلایا دوست نے تربت مٹا ڈالی
نہ ہوں گے ناصری دنیا میں بے نام و نشاں ہم سے

جنوری ۱۹۲۹ء

بہار آئی ہے بارش ہے دیدۂ تر کی
برس برس کا ہے دن خیر تیرے ساغر کی

اجل کا ہاتھ ہے عاشق کا دامنِ دل ہے
دکھائیں دیکھئے کیا گردشیں مقدّر کی

پیا جو زہر مٹی کوفت زندگی بھر کی
فنا کے نشہ میں ہم نے بڑی مہم سر کی

دلوں کے ٹکڑے کہیں مشت پر کہیں برباد
چمن تک آئی ہوا کوچۂ ستمگر کی

چراغِ طور کا شعلہ کچھ اس طرح بھڑکا
بھری ہے آگ ابھی تک رگوں میں پتّھر کی

وہ آپ قبر میں شانہ مرا ہلائیں گے
بدلنے والی ہے کروٹ مرے مقدّر کی

ستارہ صبح کا ڈوبے تو گل ہو شمعِ حیات
کہانی ختم ہے شب بھر میں زندگی بھر کی

غضب ہے راہروؤں نے تو پائمال کیا
ہوائے دشت نے خاکِ لحد برابر کی
اٹھو اب اہلِ عدم جلوہ گستری دیکھو
شعاعیں پھیل گئیں آفتابِ محشر کی
ہر ایک خط کفِ سائل کا صاف کہتا ہے
کرم کی موج سے ہے آبرو توانگر کی
چڑھا کے تیوری یہ کس سخت جاں کو ذبح کیا
مُڑی ہوئی نظر آتی ہے دھار خنجر کی
کہیں ہے دار و رسن - برق ناصری ہے کہیں
حکائتیں ہیں کئی طرح نازِ دلبر کی

دیگر

ہر زخم میں اک لطف پئے قلب حزیں ہے
ظالم! تری بیداد کی فریاد نہیں ہے

اعجازِ تمنّائے محبّت کے تصدّق
اللہ! نہ اب ہم ہیں نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

پھر مجمعِ عشاق میں تلوار چلے گی
ہنگامۂ محشر میں کوئی چیں بہ جبیں ہے

سنگِ درِ کعبہ پہ جھکے دل کو نہ دیکھا
سجدے میں کہیں جلوۂ جانانہ کہیں ہے

گردوں پہ چراغاں ہے کہ چھٹکے ہوئے تارے
تربت پہ کوئی پھول نہیں شمع نہیں ہے

فرقت کا یہ عالم ہے کہ گردوں ہے مخالف
اور پاؤں کے نیچے سے نکلنے کو زمیں ہے

یہ کہہ کے شبِ ہجر ہوئی شمع بھی خاموش
ظالم! ترے سننے کا یہ افسانہ نہیں ہے

دیگر

نگاہِ ناز سے بیتابیِ دل دیکھنے والے
نگاہیں تاڑتے ہیں رنگِ محفل دیکھنے والے

وہ ہے جوشِ تلاطم وہ مری کشتی ہے طوفانی
ذرا آگے نظر دوڑائیں ساحل دیکھنے والے

ترے چہرے پہ اب آتا ہے اک رنگ ایک جاتا ہے
خدارا دل سنبھال اپنا، مرا دل دیکھنے والے

کشاکش میں امید و یاس کی اُلجھا ہے دم میرا
کریں حل اپنی مشکل میری مشکل دیکھنے والے

صدائے لن ترانی کا بس اتنا مدّعا نکلا
نہ ٹھہرے آپ کے جلوے کے قابل دیکھنے والے

بڑی زینت ہے مقتل میں خدا رکھّے اداؤں کو
گلے خود کاٹتے ہیں شانِ قاتل دیکھنے والے

عجب انداز سے جلوہ دکھا کے تم ہوئے پنہاں
بنے تصویرِ محفل رنگِ محفل دیکھنے والے

نہ روئیں آپ بالیں پر کہیں ایسا بھی ہوتا ہے
کہ دل ہی توڑ دیں بیماریِ دل دیکھنے والے

بتائے کون حالت ناصرؔی شہرِ خموشاں کی
بنے ہیں نقشِ عبرت یاں کی محفل دیکھنے والے

دیگر

یوں چھیڑتی ہے گردشِ چرخِ کہن مجھے
مستِ ازل بنا کے دیا یہ چمن مجھے

اِس باغِ بے خزاں کی ہوائیں کہاں نصیب
تڑپا رہے ہیں عشق کے زخمِ کہن مجھے

پیری میں دیکھ لوں میں زمانہ شباب کا
ساقی ذرا پلا دے شرابِ کہن مجھے

کیں منزلیں حیات کی طے تیرے شوق میں
غربت سے کھینچ لائی ہوائے وطن مجھے

اتنا وسیع دامنِ دولت تھا دہر کا
چلنے لگا تو مل گیا دو گز کفن مجھے

جوشِ جنوں نے یوں مرا نقشہ بدل دیا
سمجھے وطن کے لوگ غریب الوطن مجھے

جب سے ہوا ہوں دور تری جلوہ گاہ سے
سونی دکھائی دیتی ہے ہر انجمن مجھے

رہتا ہے دل اُداس علیگڈھ میں ناصری
دنیا سمجھ رہی ہے غریب الوطن مجھے

دیگر

پُرسش کو موت آئی مگر نوحہ گر گئی
اللہ! کون رات یہ ہم پر گذر گئی
سچ پوچھئے تو موت بڑا کام کر گئی
دنیا میں بات رہ گئی فرقت گذر گئی
شکلیں امید و یاس کی مرتے ہی مٹ گئیں
یعنی نظر فریبیِ دردِ جگر گئی
بس مختصر یہ حال ہے عہدِ فراق کا
تم دیکھتے تو کہتے قیامت گذر گئی
ڈوبے ہوئے بتائیں گے دریائے عشق کے
کشتی جو میری ڈوبی تھی کس جا ٹھہر گئی
پر جوش مۓ غضب کی تھی ساغر میں ساقیا
آتے ہی آتے شیشۂ دل میں اُتر گئی

لطفِ امید و بیم کہاں اور ہم کہاں
یادش بخیر عمرِ دو روزہ گذر گئی

مرگِ مریضِ غم کا کوئی غم نہ کیجیے
اچھا ہوا فراق کی منزل گذر گئی

مرتے ہی میرے بڑھ گیا ہنگامہ ناز کا
برہم ہوئی تھی بزم مگر پھر سنور گئی

شاداب کیوں رہیں نہ گلِ زخمِ ناصریؔ
روتے ہی روتے ساری جوانی گذر گئی

دیگر

بڑھاؤ مشقِ ستم میری جاں ابھی کیا ہے
بتائیں گے تمھیں پھر لطفِ زندگی کیا ہے

مبارک آپ کو یہ مشقِ جانستانی کی
کسی غریب کا ارمانِ زندگی کیا ہے

جفا کے جلوے ہیں خونِ وفا کے نقش و نگار
سجی ہوئی ہے تری بزم برہمی کیا ہے

سرِ نیاز یہاں خم وہاں بل ابرو پر
بتائے کون ستمگر کو دلبری کیا ہے

رہِ وفا میں لٹا دل تو یہ ہوا معلوم
کہ دلبروں کے یہاں بندہ پروری کیا ہے

چراغِ طور کے پروانوں سے کوئی کہدے
نظر فریب ہیں جلوے کئی ابھی کیا ہے

یہ لذّتیں دلِ صد پاش ہی بتائیں گے
فضائے دشت بلا کیا ہے بے کسی کیا ہے

فقط یہ ہے کہ نمایاں ہیں نقش عبرت کے
چراغِ مردۂ تربت کی روشنی کیا ہے

دلِ شکستہ ہے اور خون آرزوؤں کا
اسی میں مست ہوں شیشہ ہے کیا پری کیا ہے

بنے گا آئینہ دارِ وفا کہ تڑپے گا
دلِ شکستہ بتا دے تری خوشی کیا ہے

مٹاتے ہیں ہمیں دشمن بھلاتے ہیں احباب
یہی ہے اور زمانے میں ناصرؔی کیا ہے

دیگر

اندھیرا چھا گیا آمد ہے بحرِ غم میں طوفاں کی
بُجھی جاتی ہے شمعِ دل۔ دُہائی شامِ ہجراں کی

بگولوں کا بڑا احسان ہے گورِ غریباں پر
چڑھا جاتے ہیں اکثر چادریں خاکِ بیاباں کی

کہاں روزِ حساب اے دل کہاں یہ دولتِ دنیا
بڑی مشکل پڑی تھی جو کفِ سائل نے آساں کی

سیرِ صحرا کیجئے یا سیرِ دریا کیجئے
دیدہ و دل بھی کسی بیکس کا دیکھا کیجئے

دیکھئے آئینے کے جانب تو مل جائے جواب
میرے دل کا مدّعا مجھ سے نہ پوچھا کیجئے

ٹوٹتے ہیں رات بھر تارے یہ رعبِ حسن ہے
بے خبر یوں آپ کوٹھے پر نہ سویا کیجئے

نیند آجائے گی بجھتی ہے بس اب شمعِ حیات
جاگنے والے مبارک ہو سحر ہوتی ہے

رباعیات

(۱)

دُنیا طلبی کیوں سحر و شام کرو
اے ناصرؔی اب دین کا کچھ کام کرو
دیکھو کتنا شباب برباد کیا
رات آگئی ہے بہت بس آرام کرو

(۲)

کثرت عصیاں کی دل کو تڑپاتی ہے
اور باغِ شباب میں خزاں آتی ہے
توبہ کرلو کہ رات ہوتی ہے اخیر
پچھلے کی دُعا قبول ہو جاتی ہے

(۳)

افزوں تپشِ قلب و جگر ہوتی ہے
ہاں کوچ کی اب گرم خبر ہوتی ہے
ظاہر ہوئے سر پہ دیکھ لو موئے سفید
بس سو چکے جاگو کہ سحر ہوتی ہے

موازنہ میر و غالب

بادشہ نظم کا غالب سا ہمہ گیر بھی تھا
لیکن اس ملک میں اک صاحبِ تسخیر […]
ہاں جلا ساز سخن نظم ہے غالب کی مگر
خاک ہو کر کوئی غیرت دہِ اکسیر بھی […]
عرش تک فکر کے توسن کو اُڑاتا غالب
راستے میں مگر اک شوخ عناں گیر بھی […]
ناز تھا فلسفہ زائی پہ اگر غالب کو
"اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی […]
اہل دل مانتے ہیں غالب کی ادا کا سکّہ
یاد رکھیں کہ کوئی درد کی تصویر بھی […]
مے پرستی میں اگر زمزمہ سنجی تھی کہیں
مرگِ دل پر کوئی نالاں دمِ تحریر بھی […]
ناصری فیصلہ غالب ہی سے سن لو تو کہو
کہ ہم آشفتہ مزاجوں کا کوئی پیر بھی […]
ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب
سُنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

تمام شد